زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان
اشاعت کا ۵۱ واں سال

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

گوشۂ منظور وقار

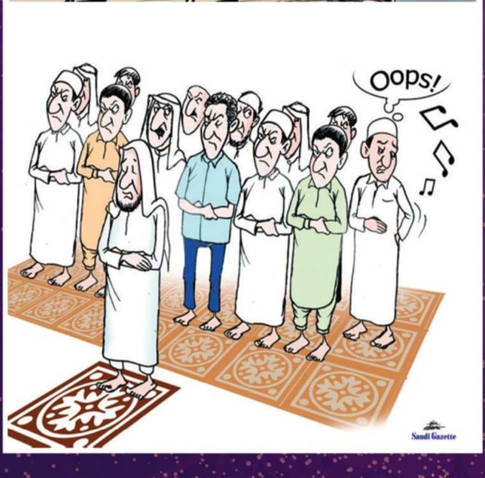

قیمت ۲۵ روپے

جون ۲۰۱۹

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

Maulana Azad National Urdu University

مرکزی یونیورسٹی جسے نیشنل اسسمنٹ اینڈ ایکریڈیشن کونسل سے ''اے گریڈ'' حاصل ہے

EPABX : 23008402-04

Directorate of Distance Education نظامت فاصلاتی تعلیم

داخلہ اعلامیہ۔ جولائی 2019 سیشن Admission Notification – July, 2019 Session

جولائی 2019 سیشن کے لیے مندرجہ ذیل فاصلاتی طریقہ تعلیم کے پروگراموں میں داخلے کے لیے آن لائن درخواستیں مطلوب ہیں:

پروگرام کا نام	میعاد	مسلمہ حیثیت
ایم اے (اردو) ایم اے (انگریزی) ایم اے (تاریخ) ایم اے (ہندی) ایم اے (عربی) ایم اے (اسلامک اسٹڈیز) **بی ایڈ (فاصلاتی طرز)**	دوسالہ	یو جی سی، ڈی ای بی، نئی دہلی کے ذریعے منظور شدہ بحوالہ مکتوب F.1-6/2018 (DEB-1) مورخہ 9/اگست 2018 اور F.1-18/2018 (DEB-1) مورخہ 31/دسمبر 2018
بی اے بی کام بی ایس سی (لائف سائنسز)۔ بی زیڈ سی بی ایس سی (فزیکل سائنسز)۔ ایم پی سی	تین سالہ	
ڈپلوما ان ٹیچ انگلش ڈپلوما ان جرنلزم اینڈ ماس کمیونکیشن	ایک سالہ	
سرٹی فیکیٹ کورس۔ اہلیت اردو بذریعہ انگریزی سرٹی فیکیٹ کورس۔ فنکشنل انگلش برائے اردو داں	چھ ماہی	

ای پراسپکٹس اور آن لائن درخواست فارم 19/مئی 2019 سے یونیورسٹی ویب سائٹ https://manuucoe.in/ddeonlineadmission19 پر دستیاب رہیں گے۔ بی ایڈ (فاصلاتی طرز) کے لیے درخواست 1000 روپئے رجسٹریشن فیس کے ساتھ آن لائن داخل کرنی ہوگی۔ جبکہ دیگر پروگرامس کے لیے درخواست 200 روپے رجسٹریشن فیس کے ساتھ داخل کی جاسکتی ہے۔

امیدوار مزید تفصیلات کے لیے طلبہ رہبری یونٹ ہیلپ لائن 040-23008463 اور 040-23120600 (ایکسٹنشن 2207) سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبہ حیدرآباد، نئی دہلی، کولکتہ، بنگلور، ممبئی، پٹنہ، دربھنگہ، بھوپال، رانچی، امراوتی، سری نگر، جموں، نوح (میوات) اور لکھنؤ میں واقع یونیورسٹی کے ریجنل / سب ریجنل سنٹرس سے بھی رابطہ کرسکتے ہیں۔ داخلہ کونسلنگ، رہنمائی وغیرہ کے لیے لنک https://manuucoe.in/ddeonlineadmission19/contactus ملاحظہ فرمائیں۔

بی ایڈ (فاصلاتی طرز) 2018 کے امیدواروں کو جو پہلے ہی درخواست جمع کر چکے ہیں، دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم، انھیں داخلہ پورٹل میں لاگ کر کے اپنی اہلیت اور قابلیت کی تفصیلات کی دوبارہ توثیق کرنی ہوگی۔

آن لائن درخواست فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ برائے **بی ایڈ پروگرام 15/جون 2019** ہے اور **دیگر پروگرامس کے لیے یکم/اگست 2019** مقرر ہے۔

ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم **www.manuu.ac.in** **رجسٹرار**

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

اشاعت کا ۵۱ واں سال

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۵۲ | گوشۂ منظور وقار | شمارہ ٦

جون ۲۰۱۹

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

اوورسیز کمیٹی

آرکیٹکٹ عبدالرحمٰن سلیم (ریاض)
ایڈیٹر اوورسیز

مہتاب قدر (جدہ)

شجاع عاطف (آسٹریلیا)

محمد عمران خاں (ابوظہبی)

مجلس مشاورت

نریندر لوتھر

ایم۔اے۔ باسط، آئی پی ایس

سید انوارالہدیٰ، آئی پی ایس

ڈاکٹر محمد علی رفعت، آئی اے ایس

جی اے نورانی، آئی آر ایس

مجلس ادارت

ڈاکٹر حبیب ضیا

ڈاکٹر فیاض احمد فیضی

نصرت ظہیر

ڈاکٹر نسیم الدین فریس

پروفیسر مقبول فاروقی

غلام نجم الدین

قیمت فی پرچہ : ۲۵ روپے

زرسالانہ : ۳۰۰ روپے

کمپیوٹر کتابت: SAM کمپیوٹرس، مغل پورہ
9246 54 3027

شگوفہ انٹرنیٹ پر
www.shugoofa.com

لائبریریوں سے : ٦۰۰ روپے

بیرونی ممالک سے ۳۵ امریکن ڈالر

Shugoofa Monthly Vol.52 Issue.6 June 2019

Edited and Published by Syed Mustafa Kamal From H.No.10-4-771/82/A/1, Owaisi pura, Masab Tank, Hyderabad-500028. Printed at Daira Press 22-8-43, Chatta Bazar, Hyderabad-2.

Phone: Editor 09885202364, (Off) 040-24745716, (Res) 040-23326185.

سب آفس: 18 & 31 بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد۔ 500001

E-mail: samurdu@yahoo.com

شگوفہ
کے لیے نیک تمنائیں

JAWAHARATUL OSMAN

جواہرات العثمان

حیدرآباد

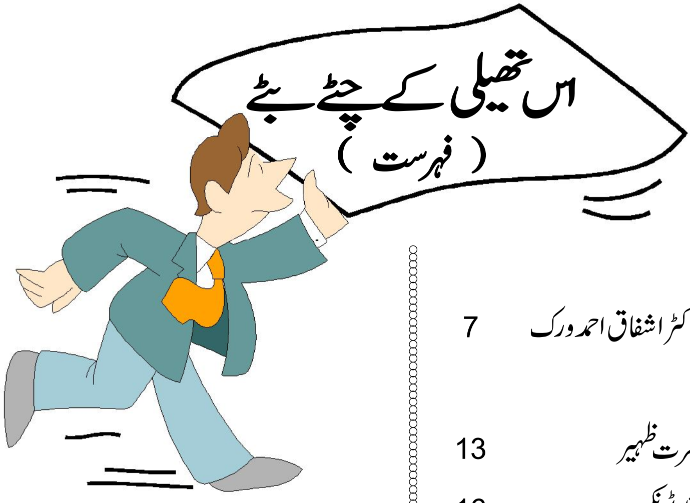

اڑیں گے پرزے (خاکہ)

ایک انوکھی لڑکی	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک	7

مال مفت (انشائیے)

کتوں کی نفسیات	نصرت ظہیر	13
اہلیہ سے عشق	مختار ٹونکی	16
تھیلی	محمد رفیع انصاری	19
فنا فی الشعر	ڈاکٹر محمد یحییٰ جمیل	22
ناک	عمر حنیف	25
اف یہ گرمی	ڈاکٹر عائشہ فرحین	27
بلائے ناگہانی	لکشمی دیوی راج	31

گوشۂ منظور وقار

جھوٹ بولے کوا کاٹے	منظور وقار	36
فنا فی الادب	ڈاکٹر غضنفر اقبال	38
قلم وقرطاس کا راکٹ	ڈاکٹر رزاق اثر شاہ آبادی	41
کاروں کی کارستانیاں	منظور وقار	44
داستاں دانتوں کی	منظور وقار	48
سامعین	منظور وقار	52
پروفیسر عبدالحمید اکبر	منظور وقار	55
محبّ کوثر: چلتی ہوئی غزلوں کا شاعر	منظور وقار	58

چورن (منظومات)

ڈاکٹر ظفر کمالی	انعام مبارک ہو	13
محمد توحید الحق	غزل	15
نشتر امروہوی	میں روزے سے ہوں	18
ہنس مکھ حیدر آبادی	غزل	24
اقبال شانہ	تیز دھوپ، گرمیوں کا موسم	32
سنیل کمار تنگ	شوخیٔ گفتار	33
نوید ظفر کیانی	غزلیں	34
سید عبیداللہ ہاشمی	موسم گرما کے روزے	35
ڈاکٹر ہادی منزہ	غزل	35

دے کے خط	مراسلے	61
پھر ملیں گے	اداریہ	64

مارکٹ میں پیش کرتے ہیں

لاسا لمسا مکس چائے

اب ہر ایک کی پسند بن گئی ہے

اتنے کم عرصے میں اتنی مقبولیت حاصل کرنا اللہ کا فضل وصدقہ نبی کریم ﷺ ہے

نیلگری ٹی ایمپوریم ۔ معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

فون: 24618340، 24745372

ڈاکٹر اشفاق احمد وِرک
لاہور

ایک انوکھی لڑکی

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۲۰۱۶ء میں مَیں اپنی زندگی کے تقریباً تمام اہم امور نمٹا کے اور سارے ضروری فیصلے کر کرا کے، بجانے کے لیے چین کی بانسری ڈھونڈ رہا تھا کہ ذونیرا بخاری ایک چھلاوے کی طرح میری مصروف ترین ہنگامی زندگی اور معروف ترین حلقۂ احباب میں دخل درمعقولات کی صورت وارد ہوئی اور پھر ریت، پانی اور ہوا کی مانند پہلے ہمارے معمولات و محسوسات اور بعد ازاں ماکولات و مشروبات کے خالی خانوں میں بھرتی چلی گئی۔ جب تک ہم کوئی احتیاطی تدابیر سوچتے یا کوئی ناقابلِ دست اندازیٔ عام و خاص پالیسی اختیار کرتے، تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

آج اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ ذونیرا بخاری کا خمیر کس چیز سے تیار ہوا ہے تو مجھے بتانے میں کوئی باک نہیں ہے کہ حُسن، ڈپریشن، انگلش لٹریچر، اردو فکشن، خوش خوراکی، خوش لباسی، بے پناہ خلوص اور آوارہ گردی کا ملغوبہ تیار کر کے، اسے قرینے سے ڈراما، فلم، موسیقی کا بگھار لگا دیا جائے تو ذونیرا بخاری بن جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انگریزی کے الفاظ Extremism,Possessiveness اور Crush کو اداسی، تنہائی اور آوارگی سے ضرب دے کر خلوص، محبت اور مروت کی مناسب چاشنی دے دی جائے تو بھی کسی نہ کسی طرح ذونیرا بخاری ہی بن جاتی ہے۔ Crush کا لفظ سن کے آپ کو کسی خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس سے آپ کو اپنا دھیان کسی مردِ رعنا یا یوسفِ ثانی کی جانب بھی منتقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اکثر اوقات اسے یہ Crush کسی دُم کٹی فاختہ، کسی اٹکھیلیاں کرتے میمنے، کسی ہونق طالب علم، کسی تالاب میں لیٹی بھینس، مرغی کی چونچ سے چونچ ملا کر چوگ لیتے چوزے، لارنس گارڈن کے کسی کلم کلے پودے یا ہاسٹل کی کسی بھوکی بلی پہ بھی ہوتے دیکھا ہے۔

یہ ہے تو انگریزی کی طالبہ لیکن اُردو ادب کا ذوق اسے ورثے میں ملا ہے۔ یہ لٹریچر میں گندھی ہوئی ایک بے چین روح ہے۔ کہانیاں سننا، کہانیاں بُننا، کہانیاں کہنا، کہانیوں میں رہنا، اس کی سرشت میں شامل ہے۔ کہنے کو تو یہ ایف سی کالج کی ایک ماڈرن ترین بستی 'ہوپ ٹاور' کی مکین ہے لیکن تخیلاتی طور پر اس کا بسیرا کہیں کوہ قاف کی کسی ہوش رُبا اور پوش بستی میں ہے۔ میرا اِس انوکھی لڑکی سے اچھی چائے، مزے دار کافی، دلچسپ کتاب، دوٹوک حساب، حِسِ مزاح، قدم قدم نزاع، مستقل بے نیازی، کراری جملے بازی، لایعنی گفتگو، بامعنی جستجو، کھلم کھلا دشمنی اور عجیب و غریب دوستی کا رشتہ ہے۔ ہم بات بے بات ایک دوسرے سے ٹوٹ کے بحث کرتے ہیں۔ انگریزی ہم دونوں کی کمزوری ہے، وہ اس طرح کہ مجھے آتی نہیں، اِس کی ختم ہی نہیں ہوتی۔

روز ایک نئے سے نئے آئیڈیے کا کوندا اس کے ذہن میں لپکتا ہے۔ خواہشات کا ایک جوار بھاٹا ہے، جو اس کے تن من میں ہمہ وقت انگڑائیاں لیتا رہتا ہے۔ پھر ہر موقع کے لیے نئی سے نئی تراکیب تراشنا بھی اس کا دل پسند مشغلہ ہے۔ ایک دن ہاسٹل سے خوش خوش آئی، وجہ پوچھی تو کہنے لگی۔۔

''آج ہاسٹل کے تمام ملازمین کو 'کرسمسی' دے کے آ رہی

ہوں۔''

'کرسمسی؟؟' مَیں نے اسے لاعلمی اور حیرت سے گھورا تو بولی:

''آپ اور میرے پاپا ہر عید پہ کالج کے ملازموں اور رشتہ داروں کے بچوں کو عیدی دیتے ہیں ناں! بس مَیں بھی آج ہوپ ٹاور کے کرسچن ملازمین کو کرسمس کے موقع پر کرسمسی دے کے آ رہی ہوں۔''

جب تک لاہور میں رہی ڈولفن پولیس کے ہیلمٹ بردار نوجوانوں کو 'مچھلے' کہہ کے مخاطب کرتی رہی۔ پچھلی گرمیوں میں، مَیں اس کی روز روز کی فرمائشوں سے شاد ہو کر اِسے لاہور کے تاریخی مقامات کی سیر کرا رہا تھا کہ بادشاہی مسجد کی عظیم الشان سیڑھیوں کے پاس روایتی خوانچہ فروشوں پہ نظر پڑتے ہی وہاں دھرنا دے کے بیٹھ گئی۔ مَیں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگی:

''مکھیوں والی چنا چاٹ کھانی ہے۔''

مَیں نے گھور کے دیکھا تو روہانسی سی ہو کر بولی:

''اب آپ بھی والدین کی طرح حِفظانِ صحت پہ لیکچر دینے نہ بیٹھ جانا۔''

چنانچہ نہ صرف اس نے خود کھائی، بلکہ کرارپنے کی دھونس میں گاہے بگاہے مجھے بھی اس کا ہم نوالہ بننا پڑا۔

ایک دن اُردو بازار جانے لگا تو پوچھنے لگی: ''وہاں کیا کرنے جا رہے؟''

بتایا کہ میری نئی کتاب تیاری کے مراحل میں ہے، آج اُس کے بٹر پیپرز نکلوانے ہیں۔

یہ نام سن کے تو مچل ہی گئی۔ کہنے لگی: ''پھر تو مجھے بھی ساتھ لے چلیں، مَیں نے بھی مکھن والے کاغذ دیکھنے ہیں۔''

شدید سردی کی آوارہ گردی میں جگہ جگہ یہ لاہور کے رکشوں کے پیچھے، رکشہ یونین کے صدر مجید غوری کی تصویر اور شدید مردانہ قسم کے عہدے داران کے نام پڑھتی رہی، پھر تواتر کے ساتھ مجھے خبردار اور گاہے ماہے اس خواہش کا بھی اظہار کرتی رہی کہ اس یونین میں زنانہ کارکنوں کی شدید کمی ہے۔ ہم نے سمجھایا کہ بی بی ایسا اس لیے ہے کہ ابھی لاہور اتنا ماڈرن نہیں ہوا کہ یہاں خواتین رکشہ چلانے لگیں۔ کہنے لگی وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن پھر بھی مجھے ان بے چاروں پہ بہت ترس آتا ہے۔ ایک روز تو مچل ہی گئی، کہنے لگی جو بھی ہے آپ تھوڑی سی کوشش کر کے مجھے اس تنظیم کی نائب صدر کیوں نہیں بنوا دیتے!!

اسی طرح ایک دن بیٹھے بٹھائے، مجھے میری مصروفیت سے بھٹکانے کے لیے بڑے رازدارانہ انداز میں کہنے بولی:

''آپ کو پتہ ہے، میری عمر چار سَو تین سال ہے۔ مَیں اکبر کے دور میں انارکلی کے ہمراہ، انارکلی بازار سے شاپنگ کرنے جایا کرتی تھی۔''

کبھی کہتی: ''کسی کو بتانا نہ، اصل میں تو مَیں پرستان کی رہنے والی ہوں، وہاں کی کوہ قاف یونیورسٹی سے پرستالوجی، عیشیالوجی، برگرالوجی، ٹرخالوجی اور خالہ خالوجی میں اب تک پانچ پی ایچ ڈیز کر چکی ہوں۔ یہ ایف سی میں تو مجھے محض شغلیالوجی یعنی تعطیلات گزارنے اور فارغ وقت میں ان دنیا والوں کے ہم خلائی مخلوق کے بارے میں مضحکہ خیز خیالات اور واہیات تصورات پہ ایک گرما گرم مقالہ تحریر کرنے کے لیے خصوصی سکالرشپ پہ بھیجا گیا ہے۔ آپ اگر آج شام میں مجھے فریٹو کا چیز برگر کھلانے کی حامی بھریں تو مَیں اپنے اس مقالے میں آپ کا نہایت اچھے الفاظ میں ذکر کرنے کا پکا وعدہ کرتی ہوں۔

اس کی اس طرح کی عجیب و غریب خواہشات اور لامحدود تخیلات کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ تو اس کے قیامِ لاہور کے زمانے میں مسلسل چلتا رہا۔ اب اگرچہ وہ بہاولپور کی ایک یونیورسٹی میں انگریزی کی ذہین اور ذمہ دار استاد ہے لیکن ٹیلی فون پہ آج بھی بامقصد بحث مباحثے کے دوران اچانک لایعنی موضوعات پہ لاحاصل گفتگو کا لامختتم سلسلہ زور و شور سے شروع ہو جاتا ہے۔

باتوں باتوں میں، مَیں آپ کو یہ بتانا تو بھول گیا کہ ذونیرا

بخاری کا مطالعہ انگریزی ، مشاہدہ اُردو ، چال پنجابی، ڈھال سرائیکی اور تال ست رنگی ہے۔ ان مختلف تہذیبوں کے امتزاج نے اس کی ذات کے اندر ایک کھچڑی سی پکا رکھی ہے۔اس کا ایک عدیم المسائل اور قدیم الوسائل کنبے سے تعلق ہے۔اکلوتی ہونے کی بنا پر اس کا ایک ایک لمحہ دیکھ بھال اور ایک ایک دن پلاننگ کے تحت گزرا ہے۔سکول اور کالج سے لے کے یونیورسٹی تک کے تعلیمی امتحانات میں گولڈ میڈل لینے کے علاوہ تقریری اور تحریری مقابلوں میں صوبائی اور ملکی سطح کے کئی ایوارڈ اور انعامات جیت چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جدید ٹیکنالوجی اور شدید ٹرخالوجی پہ گھنٹوں اور بلا تکان گفتگو کر سکتی ہے لیکن اس کی تان ہمیشہ بکری، بلی اور بطخ پہ آ کے ٹوٹتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے ساقی فاروقی کے بارے میں لکھا تھا کہ:

’چار ٹانگوں سے کم کے ذی روح سے ساقی محبت نہیں کر سکتے۔ جب سے انھوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ ہم سے محبت کرتے ہیں، ہم راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اپنی ٹانگیں ٹٹول ٹٹول کر گنتے ہیں۔‘

دوستو! جب سے ذونیرا بخاری ہماری یونیورسٹی کی زندگی میں آئی ہے، کچھ ویسا ہی حال اپنا بھی ہے۔ یہ بکریوں، بلیوں، بطخوں، خرگوشوں، لکڑ بھگوں اور بارہ سنگھوں سے ایسی بے لوث محبت کا اظہار کرتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ ساقی فاروقی کی مناسبت سے اس کا نام ’کا کی فاروقی‘ رکھ دیں۔اس کی اس قدر جانور نوازی دیکھ کے کبھی کبھی تو بندے کو اپنی ٹانگوں کی کمی اور دُم سے محرومی پہ رونا بھی آتا ہے۔ گاہے گاہے تو سڑک پہ چلتی بھیڑ بکریوں، گائے بھینسوں یا اونٹ اونٹنیوں کو دیکھ کے اس پہ ایسی وارفتگی طاری ہو جاتی کہ مجھے اس کے گاڑی سے چھلانگ لگا دینے کا خدشہ پیدا ہو جاتا۔

ذونیرا بخاری آپ کو جانوروں کی محبت میں ہر حد کراس کرنے کے لیے ہر وقت تیار ملے گی ۔کبھی کبھی تو مجھے اس کا سلسلۂ نسب بلخ بخارا کی بجائے، بطخ بخارا سے ملتا دکھائی دینے لگتا ہے۔ مجھے تو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ صرف اس کا مسئلہ نہیں بلکہ ہماری پوری نئی نسل ، انسانوں سے زیادہ جانوروں اور پرندوں سے نہ صرف حد درجہ محبت کرتی ہے بلکہ زمینی حقائق کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ذہن میں ہر وقت ایک خیالی، جمالی اور مثالی دنیا بسائے رکھتی ہے جس کے پیچھے نہ جانے ان کا لامحدود خلوص کارفرما ہے یا انسانی رویوں سے بے زاری اور مایوسی جھلکتی ہے۔ یہ ایک ذاتی، نفسیاتی اور بحثیاتی موضوع ہے، جسے ہم کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔فی الحال آپ کو بتاتے چلیں کہ ہم نے ایک دن اپنی سب سے چھوٹی بیٹی ارفع کو اپنی پالتو بلی (بلی کی ہمارے نزدیک دو ہی قسمیں ہوتی ہیں: پالتو یا فالتو) کے لاڈ لڈاتے اور اس سے بے پناہ دل بستگی دیکھ کر مذاق میں کہا کہ بیٹا تم جتنی محبت بلی سے کرتی ہو، اتنی تو شاید کبھی اپنی ماں سے بھی نہیں کی ہوگی۔ وہ بغیر کسی تأمل کے کہنے لگی:

’’ماں تو پیدا ہوتے ہی مجھے مفت میں مل گئی تھی،اس بلی کے لیے تو مَیں پورا سال تڑپی ہوں۔‘‘

نئی نسلی کی یہ منطق جان کر ہمارے لب پہ بے اختیار افتخار عارف کا یہ شعر اپنی ہیئت بدل کے وارد ہوا:

’’بلی‘‘ کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

مَیں آپ کو بتاتا چلوں کہ ذونیرا بخاری کی کیفیت تو ارفع سے بھی چار ہاتھ آگے ہے۔ اس کے ماں باپ چاہے اکلوتی لاڈلی بیٹی کی ایک فون کال کو ہفتوں ترستے رہیں، عید بقرعید پہ اس کا رستہ دیکھتے دیکھتے مفتی منیب الرحمٰن کے کلاس فیلو بن جائیں لیکن یہ ہے کہ بلیوں، کتوں، چیلوں، کووں، چڑیوں، کبوتروں، فاختاؤں، موروں، چکوروں سے بغیر وائی فائی کے بلا ناغہ اور بے تکان گفتگو کرنے میں گھنٹوں گزار دے گی۔ یہ انسانی رویوں سے اس قدر شاکی ہے کہ اسے ہمہ وقت خیالوں کی نگری آباد رکھنے میں مزا آتا ہے۔ یہ آس پڑوس کے لوگوں کی بجائے پریوں اور جنوں کی محبت میں بھی گردن گردن تک غرق رہتی ہے۔ یہاں

تک کہ اگر اسے کبھی کسی فلم کا ٹاسک ملے تو مجھے پورا یقین ہے کہ اس میں اپنوں، بے گانوں، عزیزوں، رشتہ داروں حتیٰ کہ عام انسانوں کی بجائے سانپ نیولے اور بھوت چڑیلیں ہی اس کے ہیرو ہیروئن ہوں گے۔

آج تک ایک بات میری سمجھ سے بالا ہے کہ اس قدر جناور بھگت ہونے کے باوجود ہر روایتی لڑکی اور گھریلو عورت کی طرح چھپکلی سے اس کو بھی خدا واسطے کا خوف ہے۔ کہیں بھولے سے بھی چھپکلی کا لفظ آ جائے تو وہیں Still ہو جاتی ہے۔ لگتا ہے زمین اس کے پَیروں سے کِھسک چکی ہے۔ تن بدن تو رہا ایک طرف، اِس کی روح کے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ بات شاید آپ کے لیے حیران کُن ہو کہ اس کے والدین ہاسٹل کے ملازمین کو اس کے باتھ روم سے چھپکلیوں کو دور رکھنے کا باقاعدہ معاوضہ ادا کرتے رہے ہیں۔ کچھ ہی عرصہ پہلے کا ذکر ہے کہ ایک رات نو بجے روتے ہوئے اِس کا فون آیا کہ آپ اسی وقت میرے ہاسٹل آ سکتے ہیں؟

کوئی ایمرجنسی ہے؟ ہم نے دریافت کیا۔

''بہت بڑی ایمرجنسی!!''

ہم نے بے شمار خدشات اور الھڑ جذبات کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے، حوصلہ دینے والے انداز میں ایمرجنسی کی نوعیت جاننے کی کوشش کی، تو زار و قطار روتے ہوئے کہنے لگی:

''مَیں دو گھنٹے سے باتھ روم کے باہر بیٹھی ہوں، ایک خوف ناک اور بدتمیز چھپکلی باتھ روم کے دروازے سے ہلنے کا نام نہیں لے رہی...... ملازم بھی نہ جانے کہاں مر گیا ہے؟...... گارڈ آنٹی تو ویسے ہی مجھے اس چھپکلی کی رشتے دار لگ رہی ہے، جو اس سے مذاکرات کرنے کے لیے بھی ٹس سے مس نہیں ہو رہی...... ماما کو فون کیا تو انھوں نے بے شمار نصیحتوں کے بعد ڈانٹ ڈپٹ کر فون بند کر دیا...... اب آپ ہی بتائیں، میری بھی بھلا کوئی زندگی ہے؟...... ساری دنیا سے مایوس ہو کے اب یوں سمجھ لیں کہ آپ ہی میری امیدوں کا آخری سہارا ہیں۔''

ہم نے فون پر ہی اِس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے اسے وائپر، شاور یا چھڑی سے چھپکلی کو بھگانے کے کئی آزمودہ طریقے آسان اُردو میں سمجھانے کی اپنی سی بہتیری کوشش کی لیکن یہ ہے کہ مطمئن ہونے یا صورتِ حال کو سمجھنے کے بجائے باقاعدہ دھاڑیں مار مار کے روتے ہوئے بولی:

''گھر بیٹھ کے باتیں کرنا کتنا آسان ہے۔۔۔ پتہ تو اُس کو ہوتا ہے، جس کی جان پر بنی ہو۔''

چلتے چلتے آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ ذونیرا بخاری ہمارے نہایت محترم دوست پروفیسر طاہر بخاری جیسی وضع دار شخصیت اور محترمہ شاہدہ بخاری جیسی سلیقہ شعار خاتون کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے، یعنی ان کی مشترکہ، اکلوتی اور لاڈلی اولاد ہے۔ اکلوتی ہونا بہ یک وقت اس لڑکی کی سب سے بڑی خوش قسمتی اور سب سے بڑا مسئلہ بھی ہے۔ مَیں اس کی خوش بختیوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو وسائل اور فضائل کا ایک مینار سا بنتا چلا جاتا ہے، لیکن جب اس کے مسائل پہ نظر کرتا ہوں تو آفات اور مشکلات کا لا محدود سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس کے 99.9 فی صد مسائل خود ساختہ ہیں۔ اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس کا سرے سے مسئلہ ہی کوئی نہیں۔ جن چیزوں کو یہ مسئلہ سمجھتی ہے، یار لوگ تو ان کو زندگی کی عیاشیوں میں شمار کرتے ہیں۔ اس کا مسئلہ یہ نہیں کہ کھانے یا پہننے کو کچھ نہیں، بلکہ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ اتنی چیزیں کھائے گا کون؟ اور کون سے سوٹ کی کس دن باری آئے گی؟

مَیں سمجھتا ہوں کہ اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یہ بہت ذہین ہے، اس کا دوسرا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یہ ضرورت سے زیادہ سوچتی ہے۔ باقی جملہ مسائل انھی دو سمسیاؤں کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ بعض اوقات تو اس کے تخیل و تفکر کی پرواز اتنی بلند، منھ زور اور پہلو دار ہوتی ہے کہ لگتا ہے پورا بہاول پور کسی ذاتی مجبوری یا حکومتی جبر کی وجہ سے سوچنا چھوڑ بھی دے تو اس کام کے لیے یہ اکیلی ہی کافی ہے۔ مَیں آپ کو بتاتا چلوں کہ اس کے مسائل کے

ڈانڈے باتھ روم سے چھپکلی کو بے دخل کرنے سے لے کے،کوہ قاف میں گھر بنانے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اکثر اوقات بڑے سے بڑے مسئلے کو بھی اُمت مسلمہ کی طرح چُپ چاپ سہہ جاتی ہے اور بعض دفعہ چھوٹی سے چھوٹی بات پہ بھی تیسری جماعت کی بچی کی مانند ایسا پھوٹ پھوٹ اور ٹوٹ ٹوٹ کے رونے لگے گی کہ اسے ون ون ٹو ٹو والے بھی چپ نہیں کروا سکتے۔

اور دوستو! آپ کو بتاتا چلوں کہ کسی خاص سبب یا معقول جواز کی آڑ میں رونے دھونے کا اہتمام تو شاید ہم سب کسی نہ کسی طرح کر ہی لیتے ہیں لیکن بغیر وجہ یا مسئلے کے گریہ وزاری کے نئے سے نئے اسالیب تراشنے کا جو ملکہ، اِس ملکۂ جذبات کو حاصل ہے، ہَمہ شمہ تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر میر، فانی یا راشد الخیری آج کے زمانے میں ہوتے تو واٹس اپ پہ دھوم دھام سے ایک گریہ گروپ تشکیل دیتے اور باہمی رضا مندی سے اسے اُس گروپ کا ایڈمن مقرر کرتے۔شاعرِ مشرق نے اپنے تخلیقی وفور کی شِدت بیان کرنے کو اپنے لیے بلبل کی علامت اختیار کرتے ہوئے کہا تھا:

اس کے سینے میں ہے نغموں کا طلاطم اب تک

سچ پوچھیں مجھے تو یہ بھی اسی قبیل کی کوئی بلبل، مَینا، کوئل یا قمری لگتی ہے، جس کے دل و دماغ میں ہر وقت اچھوتے خیالات، انوکھے واقعات اور رنگا رنگ خدشات کی پھلجھڑیاں سی چھوٹتی رہتی ہیں۔ اس کے ذہن میں نئے سے نئے خیالات، غیر متعلق محسوسات اور گنجائش سے کہیں زیادہ تصورات کا لاوا چوبیس گھنٹے پکتا رہتا ہے۔ یہ سوچتی کم اور محسوس زیادہ کرتی اور اثر اس سے بھی کہیں زیادہ لیتی ہے۔

اِس کے اسی منھ زور تخیل کو لگام دینے، دھیان بٹانے یا اس کے بے پناہ ادبی ذوق کی تسکین کی خاطر ہم نے اور اس کے اہلِ خانہ نے اس کے لیے افسانہ نگاری کی سازش تیار کی، چند ہی مہینوں میں جس کا فوری اور توقع سے فزوں تر نتیجہ 'چندراوتی' کی صورت قارئینِ ادب کے سامنے آ گیا۔ ابھی اُردو افسانوی ادب کے ساتھ اِس کی چٹ منگنی، اور پٹ بیاہ پہ لوگ پوری طرح انگشت بدنداں بھی نہیں ہوئے تھے کہ نو ماہ سے بھی کم عرصے میں 'مائیگرین اور محبت' کی تولید عمل میں آ گئی۔ اِس کی طوفانی جذباتیت اور ہیجانی حسّاسیت کو دیکھتے ہوئے آج مَیں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم نے اس کے تصورات کے سَیلِ بلا کا دھارا افسانہ نگاری اور خیالی دنیا کی طرف نہ موڑ دیا ہوتا تو آج ہم اس کی کتاب کی تقریبِ رونمائی میں دانش وری بگھارنے کی بجائے اس کے چالیسویں کے اکٹھ میں مزے مزے سے قورمہ اور پلاؤ اڑا رہے ہوتے۔

مجھے نہایت قلیل مدت بلکہ کہنا چاہیے کہ پینسٹھ کلومیٹر کی رفتار سے لکھی ان دونوں مجموعوں کی کہانیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہو رہا ہے کہ تعلیمی دنیا کی طرح اِس میدان میں بھی اِس کا فرسِ تخیل جس شدت اور حدت کے ساتھ رواں ہوا ہے، اگر اس کا خوب سے خوب تر کی تلاش کا یہ سفر اسی استقامت، ذہانت اور متانت کے ساتھ مثبت سمت میں جاری رہا تو اسے اردو کی قابلِ رشک فکشن رائٹر بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

۱۱ اپریل ۲۰۱۹ء

☆……○……☆

"خدارا حج اور عمرے کو ایک مذہبی پکنک نہ بنائیے"

ہندو پاک سے نفل حج اور عمرہ پر بار بار آنے والوں کے نام ایک کھلا خط

تصنیف: علیم خان فلکی

ای میل کاپی کے لیے رابطہ:

aleemfalki@yahoo.com

ڈاکٹر ظفر کمالی، سیوان

انعام مبارک ہو

(ایک سرکاری اکادمی نے کچھ دن پہلے ایک مشہور متشاعر کو اس کی ''ادبی خدمات'' کے لیے انعام سے نوازا۔ یہ نظم اسی خوشی میں کہی گئی ہے۔ ظ۔ک۔)

بدنامِ زمانہ کو یہ نام مبارک ہو
ساقی ہی جب اندھا ہے تو جام مبارک ہو

پردے میں ہوا ہے جو وہ کام مبارک ہو
خوابوں کی حسیں دل کش یہ شام مبارک ہو

اعزاز مبارک ہو اکرام مبارک ہو
دھوکے کا خوشامد کا انعام مبارک ہو

گونگا ہے مگر اس کی آواز قیامت ہے
بے پَر ہی سہی لیکن پرواز قیامت ہے

وہ کیسا سخن ور ہے ، یہ راز قیامت ہے
انجام خدا جانے ، آغاز قیامت ہے

اس نے جو مچایا ہے کہرام مبارک ہو
دھوکے کا خوشامد کا انعام مبارک ہو

اردو کو سمجھتا ہے وہ مال تجارت کا
ہر سَمت بچھاتا ہے وہ جال سیاست کا

گھونٹا ہے گلا اس نے بالجبر صداقت کا
وارث ہے وہی اصلی نٹور کی وراثت کا

ہے شاخِ مغیلاں کا یہ آم مبارک ہو
دھوکے کا خوشامد کا انعام مبارک ہو

انعام لگا ملنے خیرات کی صورت میں
کچھ کام نہیں لیکن ''خدمات'' کی صورت میں

اس قوم کی صورت میں اُس ذات کی صورت میں
اردو کے تعلّق سے ہر گھات کی صورت میں

ننگوں سے بھرا اس کو حمّام مبارک ہو
دھوکے کا خوشامد کا انعام مبارک ہو

مانگی ہوئی غزلوں کے اشعار کا پیسہ ہے
یہ فرضی فضیلت کی دستار کا پیسہ ہے

ہم کیسے کہیں اس کو بے کار کا پیسہ ہے
جو چاہے اسے لوٹے سرکار کا پیسہ ہے

ہوتا ہے ضمیروں کا نیلام مبارک ہو
دھوکے کا خوشامد کا انعام مبارک ہو

......☆......

نصرت ظہیر
نئی دہلی

کتّوں کی نفسیات

تنبیہ الغافلین: اس مضمون میں مذکور تمام کتّے فرضی ہیں، اور اصلی کتّوں سے ان کی مطابقت محض اتفاق ہے جس کے لیے کُتّے خود ذمہ دار ہوں گے راقم السطور نہیں۔ نجیب الطرفین کتّے یہ بات خاص طور پر نوٹ کرلیں۔

اب ہم مضمون شروع کرتے ہیں۔ مگر پہلے ایک ضروری بات۔ اپنی ذات سے مجھے پورا یقین ہے کہ میرے مضامین میں طرح طرح کی اول جلول باتیں پڑھ کر اب تک آپ کافی بور ہو چکے ہوں گے۔ اس لیے آج ذرا موضوع بدل لیا۔ کتّوں پر میں پہلے بھی کئی بار خامہ فرسائی فرما چکا ہوں مگر اس بار ذرا زیادہ سنجیدہ ہوں، اور خدا کی اس مخلوق کا نفسیاتی جائزہ لینے کے موڈ میں ہوں۔

سب سے پہلے ہم کتّوں کی ذاتیات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ میرا خیال ہے کتّوں پر سب سے زیادہ ظلم اردو اور ہندی زبانوں نے کیا ہے جن کی بدولت کتّے جانور کم اور گالی زیادہ بن گئے ہیں۔ انگریزی میں انھیں ڈاگ یا ڈاگی کہا جاتا ہے۔ فرنچ میں شیاں، عربی میں کلب، فارسی میں سگ، سنسکرت میں کُکُّر۔ بنگالی میں کُکُرا، تمل میں نائے، کشمیری میں ہؤن۔ ان سبھی زبانوں میں آپ کسی کو کتّا کہہ دیجیے تو وہ عام طور پر برا نہیں مانے گا۔ لیکن کسی اردو ہندی بولنے والے کو کتّا کہہ کر دیکھ لیجیے۔ وہ آپ کے پیچھے پڑ جائے گا۔

مگر ایسا نہیں کہ ان زبانوں میں صرف کتّے کو ہی ذلّت کی فضیلت حاصل ہے۔ گدھا اور الّو بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ انگریزوں کے یہاں گدھے کو صبر، جفاکشی اور بردباری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ امریکہ میں تو گدھا ڈیموکریٹک پارٹی کا نشان بھی ہے، اوراس رعایت سے امریکی گدھے خاصے جمہوریت پسند مانے جاتے ہیں۔ عرب، ایران، افغانستان وغیرہ میں لوگ گدھے کو ایک معزز سواری مانتے ہیں۔ بلکہ ملّا نصیرالدین کا گدھا تو دانش مند بھی تھا۔ اسی طرح الّو کو یورپ میں عقل و دانش کی علامت مانا جاتا ہے اور کوئی بھی اسے منحوس نہیں سمجھتا۔ لیکن دنیائے اردو میں کسی کو گدھے جیسا صابر یا الّو جیسا عاقل کہہ کر دیکھ لیجیے۔ وہ فوراً لڑنے مرنے کو تیار ہو جائے گا۔

تاہم ان تینوں جان داروں میں کتّے کو ہم ہندوستانی ذلّت کی آخری حد مانتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہندوستان کا کتّا خود بھی اپنے آپ کو کتّا کہلوانا پسند نہیں کرتا۔ اس سلسلے میں راقم ذاتی طور پر تجربہ کر چکا ہے اور آپ بھی چاہیں تو تجربہ کر کے دیکھ سکتے ہیں، مگر صرف اپنی ذمہ داری پر۔

تجربے کی تفصیل یہ ہے کہ میں نے ایک گدھے کو گدھا کہہ کر دیکھا۔ اس کے چہرے سے کوئی ردّ عمل ظاہر نہیں ہوا۔ میں نے پھر گدھا کہا۔ مگر وہ اب بھی خاموش رہا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس نے میری طرف دیکھا تک نہیں۔ میں نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ ہلا کر زور سے کہا، ابے گدھے کہیں کے، کچھ تو بول! مگر اس نے صرف آنکھیں جھپکائیں اور پھر اسی طرح بے نیاز ہو گیا۔

اس کے بعد میں نے بڑی مشکل سے ایک الّو ڈھونڈا جو کسی ویرانے میں خاموش بیٹھا تھا۔ یوں بھی ہمارے یہاں عاقل بڑی مشکل سے ملتے ہیں اور ملتے ہیں تو سب سے الگ خاموش بیٹھے

ہوئے۔ خیر، میں نے چپکے سے اس کے پاس جا کر زور سے کہا، اُلّو۔ نام سنتے ہی اس نے میری طرف گردن گھمائی اور گول گول آنکھوں سے گھور کر نہ جانے کس بات پر غور کرنے لگا۔ یہ منظر اتنا ہیبت ناک تھا کہ میں کافی ڈر گیا اور الّو کو اس کے حال پر چھوڑ کر چلا آیا۔

آخر کار میں ایک کتّے کے پاس پہنچا جو فٹ پاتھ پر لیٹا بڑے آرام سے آرام کر رہا تھا۔ اسے ادب سے مخاطب کرتے ہوئے میں نے کہا، کہو میاں کتّے کیسے ہو؟ یہ سنتے ہی وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ میں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ واپسی کی دوڑ لگا دوں کیونکہ اس کا احتجاج سن کر آس پاس کے کئی اور کتّے حمایت میں نعرے لگاتے ہوئے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن میں نے کبھی کسی کتّے کو کتّا نہیں کہا۔

اب آیئے کتّوں کی نفسیات پر غور کرتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے اس کے ساتھ ساتھ ہمیں انسانی نفسیات پر بھی نظر ڈالتے رہنا چاہیے، کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ انسانوں میں بھی کئی بار کتّے کی نفسیات سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں اس میں زیادہ قصور کتّوں ہی کا ہے۔ آخر انھوں نے اپنی نفسیات کا پیٹنٹ کیوں نہیں کرایا۔ کم سے کم کاپی رائٹ کے تحت اپنی نفسیات کے جملہ حقوق ہی محفوظ کرا لیتے۔ یہ تو نہ ہوتا کہ جب بھی جس انسان کے جی میں آیا کتّا پن اختیار کر لیا اور شریف انسانوں پر چڑھ دوڑا۔ سوچیے اس سے کتّوں کی کتنی بدنامی ہوتی ہوگی۔ جملہ حقوق محفوظ ہوتے تو جب بھی کبھی کسی انسان کو کتّا بننے کی حاجت ہوا کرتی تو اسے باقاعدہ کتّا برادری سے اس کی اجازت لینی پڑتی اور برادری چاہتی تو گھر بیٹھے اس سے اپنی نقالی کی اجرت وصول کرتی رہتی۔

کتّے کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے اس کی دُم کا مطالعہ بھی بے حد ضروری لیکن اس ضمن میں کوئی نئی بات کہنا میرے لیے مشکل ہے کیونکہ محترم نریندر لوتھر اس پر پہلے ہی عالمانہ و محققانہ طبع آزمائی فرما چکے ہیں۔ کتّے کی دُم پر ان کا مشہور مضمون برسوں پرانا ہو چکا ہے مگر اس کی قدر و منزلت کا درجہ آج بھی اتنا بلند ہے کہ سنا ہے مضمون کی اشاعت کے بعد سے اب تک حیدرآباد میں کبھی کسی کتّے نے ان کی رہائش گاہ کے آگے سے گزرتے ہوئے، نہ تو احتراماً اپنی دم ہلائی نہ وہ بیہودگی کی جو یہ حضرات اکثر بجلی کے کھمبوں وغیرہ کے ساتھ انجام دیا کرتے ہیں۔

کتّے کی نفسیات میں خوف کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اکثر وہ بھونک کر دوسروں کو ڈرا دیتا ہے لیکن کوئی اُس پر اُس سے تیز آواز میں بھونک دے تو وہ خود ڈر جاتا ہے۔ تاہم دونوں صورتوں میں وہ بھونکتا ضرور ہے۔ بس یہ ہے کہ ڈرانے والی بھونک اور ڈری ہوئی بھونک میں سُر تھوڑے سے بدلے ہوئے ہوتے ہیں، اور موخرالذکر بھونک میں خرخراہٹ کی آواز ذرا زیادہ نمایاں رہتی ہے۔

کہتے ہیں کتّا انسان کا سب سے پرانا دوست ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ ان ہزاروں لاکھوں برسوں میں کتّے نے انسان سے اور انسان نے کتّے سے بہت کچھ سیکھ لیا ہوگا۔ لیکن جب غور کرتا ہوں، اور اس غور و خوض کے نتیجے پر احتیاطاً دوبارہ غور کر لیتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ میرا خیال غلط تھا۔ دونوں حضرات دوست ہوتے ہوئے بھی آج تک ایک دوسرے سے خاصے اجنبی ہیں۔ بقول ساحر لدھیانوی:

اتنے قریب آ کے بھی کیا جانے کس لیے
کچھ اجنبی سے آپ ہیں کچھ اجنبی سے ہم

مثلاً انسان نے دُم نہ ہوتے ہوئے بھی کتّے سے دُم ہلانا اور رال ٹپکانا تو سیکھ لیا لیکن وفاداری نہیں سیکھی۔ دوسری طرف کتّا انسان کے اتنا قریب رہتے ہوئے بھی نہ تو سازشیں کرنا سیکھ پایا، نہ زر زمین اور زن کے لیے دنیا کو تہ و بالا کرتے رہنے کی عادت ڈالی، نہ قوم، وطن اور مذہب ایجاد کر کے اُن کے نام پر جنگیں کرانے کا ہنر سیکھا۔ یہاں تک کہ کتّوں نے سیاست بھی نہیں سیکھی۔ ارتقائی عمل بھی دونوں کا مختلف رہا ہے۔ انسان نے

لومڑی سے مکّاری، لکڑبھگّے سے عیاری، گیدڑ سے اداکاری، طوطے سے طوطا چشمی، گرگٹ سے رنگ بدلنا اور سانپ سے بل کھا کر چلنا سیکھ لیا مگر کتّا شروع سے کتّا چلا آرہا۔ اسی طرح انسان نے دنیا بھر میں بولنے کی ہزاروں زبانیں ایجاد کر کے لوگوں کو ایک دوسرے سے بیگانہ کر دیا مگر کتّا ابھی تک صرف بھوں بھوں پر ٹکا ہوا ہے۔

دیکھا جائے تو کتّے نے انسان سے سب سے اہم بات یہ سیکھی ہے کہ صرف اپنوں کا خیال رکھو اور غیر کی ایسی تیسی کر دو۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک محلّے کا کتّا غلطی سے کسی اور کتّے کے انتخابی حلقے میں داخل ہو جائے تو موخرالذکر اور اس کے حواری کیسے اسے گھیر کر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔

کئی کتّوں کی زندگی میں ایک مقام وہ آتا ہے جب وہ نفسیات و جبلّیات سے محروم ہو کر پاگل ہو جاتے ہیں۔ ایسا کتّا کسی آدمی کو کاٹ لے تو اُسے (آدمی کو) ایک درجن سے زیادہ انجکشن لگوانے پڑتے ہیں۔ ایسا نہ کیا جائے تو آدمی بھی پاگل ہو جاتا ہے، پانی سے ڈرنے لگتا ہے اور کہتے ہیں کہ بھونکنا بھی شروع کر دیتا ہے۔ بزرگ کہتے ہیں اس صورت میں کاٹنے والے کتّے پر نظر رکھنی چاہیے کیونکہ اگر وہ مرگیا تو پھر آدمی کی موت بھی یقینی ہے۔ عظیم فلسفی مرزا غالب نے اس صورت حال پر کتّے اور آدمی کے حوالوں سے ایک زبردست طنز کیا ہے۔ اور وہ بھی اپنی نوجوانی کے اس زمانے میں جب نہ تو وہ غالب بنے تھے نہ کتّوں کا کوئی خاص تجربہ ہوا تھا۔ دیکھیے صرف آدمی کے تجربے کی بنیاد پر پانی اور آئینے کی رعایت سے کتنا بڑا شعر کہہ دیا۔ پڑھیے اور سر دھُنیے (صرف اپنا!)۔

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

خدا حافظ!۔۔

☆......○......☆

nusratzaheer@gmail.com

محمد توحید الحق
کامٹی، ضلع ناگپور

غزل

دنیا میں اپنے نام کا ڈنکا بجا کے رکھ
القاب جتنے ہو سکیں سارے لگا کے رکھ

مٹی پلید کر کے ہی چھوڑے گی ایک دن
بیگم کو اِس طرح سے نہ سر پہ بٹھا کے رکھ

آتے ہیں آڑے وقت میں یہ کام بھی بہت
غنڈے ہیں جتنے شہر میں سب کو پٹا کے رکھ

تاکید میری ساس کی بیٹی کو ہے یہی
شوہر ہو سامنے تو سدا منہ پھلا کے رکھ

نکلے ہیں پھر وہ شہر میں خیرات بانٹنے
تو بھی کسی فقیر کا حلیہ بنا کے رکھ

پڑھ لے جو ایک بار تو ہوجائے بیڑا پار
دیوان اِس طرح سے نہ میرا سجا کے رکھ

نادان یہ نہیں ترے باوا کی خانقاہ
یہ محفلِ ادب ہے یہاں سر جھکا کے رکھ

○

مختار ٹونکی
راجستھان
9214826684

اہلیہ سے عشق

ویسے تو شاعروں کے چچا مرزا غالبؔ عشق پیشہ لوگوں کے لیے فرما گئے ہیں کہ:

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

ان کا یہ کہنا کسی حد تک ٹھیک بھی ہے کیوں کہ وہ خود بڑے کام کے آدمی تھے لیکن ڈومنی کے عشق نے ان کو نکما اور ناکارہ کردیا تھا۔ اب چاہے عشق دماغی خلل ہو کہ ذہنی فتور قسام ازل نے بہ قدر ظرف اشرف المخلوقات کو عشق کے جرثوموں سے نہال و مالا مال کیا ہے۔ ارے حضور! آپ مانیں یا نہیں مانیں لیکن یہ عظیم سچائی ہے کہ

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

اور درد دل کا عارضہ ایسا ہے کہ اس سے سفر حضر میں بھی مفر ممکن نہیں۔ پہلے ہوتا ہے پیار ویار پھر چاہت و محبت رنگ دکھاتی ہے اور محبت میں جب جنوں کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں تو عشق انگڑائیاں لے کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ یعنی آپ یوں سمجھیے کہ عشق پیار کی سپر لیٹیو ڈگری ہے۔ پھر یار لوگوں نے عشق خانہ خراب وفضیلت مآب کی دو شکلیں بتائی ہیں کہ عشق حقیقی اور عشق مجازی۔ ہماری غیر صائب رائے میں ان کی تشریح و توضیح اس طرح ہو سکتی ہے کہ

(الف) عشق حقیقی وہ عشق ہے جو اپنے الٰہی سے کیا جائے اور

(ب) عشق مجازی وہ عشق ہے جو اپنی اہلیہ سے کیا جائے۔

چونک گئے نا! ہمارے بے تکے لکھے پر کہ ہم نے بے فائدہ اور بے قاعدہ دنیاوی عشق کا ناتا اہلیہ سے جوڑ دیا ہے اور حقیقت کو مجاز سے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ لاریب آپ کہہ سکتے ہیں کہ میاں عقل کے ناخن لو اور ہوش کی دوا دارو کرو کہ یہ اہلیہ سے عشق نہ ہوا بلکہ سراسر 'زن مریدی' ہے اور برابر شوہر فضیحتی ہے۔ بھلا اہلیہ اس کی اہل کہاں کہ اسے یہ رتبۂ بلند عطا کیا جائے اور اسے مسند عشق کی سرفرازی سے نمایاں کیا جائے۔ در جواب ایں غزل عرض ہے کہ ناخدائے سخن میرؔ نے تو عشق کے بارے میں فرمایا تھا کہ

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

اور ہم بقید ہوش وحواس مع تاویلات بابانگ قلم مشورہ معقول دیتے ہیں کہ:

دل کی لگام کو نہ کبھی ڈھیل دیجیے
کرنا ہی ہے جو عشق تو بیوی سے کیجیے

ہمیں معلوم ہے کہ آپ کے دماغ میں ابھی بھی وسوسوں کی کھچڑی پک رہی ہے کہ شرعی نکاحی بیوی سے عشق؟ لاحول ولاقوۃ۔ کرہ گیتی پر قطب شمالی سے لے کر قطب جنوبی تک ایک بھی مثال محال ہے کہ کوئی بیوی کا شوہر اپنے دھڑکتے دل اور پھڑکتے کلیجے پر ہاتھ رکھ کر ایمان داری سے یہ کہہ سکے کہ مجھے اپنی پیاری بیوی سے بلا کا عشق ہے۔ گھر کی مرغی دال برابر۔ ارے میاں! وفا کیسی، کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا لازمی ٹھہرا تو بیوی کا ہی سنگ آستاں کیوں ہو؟ ...... آپ نے کچھ کچھ بجا فرمایا لیکن ہمارے مشورے پر غور نہیں فرمایا۔ ذرا سوچئے! عشق حقیقی تو دور کے ڈھول سہانے ہیں اور عشق مجازی کے بگل آپ کو بجانے ہیں تو کس کافر ادا کی دہلیز پر آپ قدم رکھیں گے اور کس کی چوکھٹ پر اپنی جبین نیاز رگڑیں گے۔ کوئی تو معشوق چنیں گے۔ حضور عشق گنجور! وہ زمانے لد گئے کہ جب قیس عامری مجنوں بن کر صحرائے

نجد کی خاک چھانتا تھا اور پھٹے حال دیوانہ وار کہتا تھا:

لیلیٰ لیلیٰ پکاروں میں بن میں
لیلیٰ پیاری بسی مورے من میں

اور وہ عہد عاشقی بھی رخصت ہوا کہ جب مسٹر فرہاد شیریں کے لیے جوئے شیر نکالنے کے چکر میں گھن چکر ہو کر پہاڑ کاٹنے کی حماقت کر بیٹھے تھے۔ یقیناً عشق نامراد کے پھیر میں آپ سوچتے ہوں گے کہ کوئی نیل کی ساحرہ، قلوپطرہ، آپ کے لیے دوڑ کر دل کی چال سے آئے گی۔ کوئی جنت کی حور آسمان کی بلندیوں سے ٹپکے گی اور پرستان کی کوئی پری آ کر آپ کے پژمردہ دل کو گدگدائے گی۔ واللہ! یہ خواب و خیال کی باتیں ہیں بلکہ خرافاتیں ہیں۔ کہہ دیں کہ آج کل کی محبوبائیں خالی خولی محبت کی روادار نہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ کوئی ایسا عاشق کاذب ملے جو دم دار نہ ہو مگر دام و درم دار ہو۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ

عشق اول در دل معشوق پیدا می شود

در پردہ محبت اور غائبانہ عشق بھی فی زمانہ لغویت ہے۔ آپ کو سچی گہری محبت اور عشق مجازی کے لیے کوئی ارضی معشوق بہر حال دستیاب کرنا پڑے گا جو جوابی پوسٹ کارڈ کی طرح آپ کے عشق پر لبیک لبیک کہہ سکے۔ ایسی صورت حال کے وبال میں بیوی ہی عشق کی مستحق ہے۔ مکرر ارشاد کہ اس کام کے لیے اہلیہ ہی اہلیت کی حامل ہے۔ صاحبو! ہما شما کیا شہنشاہوں نے اپنی بیویوں سے عشق کیا ہے۔ آپ نے مغل بادشاہ جہانگیر کا نام تو سنا ہوگا۔ وہ چاہتا تو اپنے لیے معشوقوں کے انبار لگا سکتا تھا مگر اس کو اپنی بیوی نور جہاں سے اس قدر شاہانہ اور والہانہ عشق تھا کہ بھرے دربار میں پردے کے پیچھے سے نور جہاں اس کی پشت پر ہاتھ دھرے اپنی موجودگی کا احساس کراتی رہتی تھی۔ دست برخاست کہ دربار برخاست۔ اسی طرح شہنشاہ شاہجہاں کی اپنی بیوی ممتاز محل سے عشق کی رنگین وسنگین داستان تو آج بھی تاج محل ہر آئے گئے کو سنا رہا ہے۔ یاد رکھیں کہ عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب ہوتی ہے اور بہت سے عشاق تو زلف کے سر ہونے سے پہلے ہی ملیا میٹ ہو جاتے ہیں۔ ویسے بھی بقول مومن دہلوی:

در بدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے

اگر عاشق ایک کھونٹے سے بندھ جائے تو اس کا بھلا ہوتا ہے۔ خیر! چھوڑیئے اِدھر اُدھر کی باتوں کو ہم تو بس یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ منکوحہ زوجہ سے عشق فرمانے میں مزے ہی مزے ہیں اور فائدے بھی بہتیرے ہیں۔ اگر آپ اپنی بیوی کو ہی کوئی بت طناز اور محبوبۂ دلنواز سمجھ کر عشق کی راگنی گائیں تو بہاریں پھول برسائیں گی اور مسرت و انبساط کی گھٹائیں جھوم کر آئیں گی۔ ارے صاحب! یہ کہاں کی عاشقی ہے کہ کسی ایرے غیرے نتھو خیرے محبوب سے جھوٹ موٹ یہ کہا جائے کہ جان من! تمہارے سر کی قسم، میں تمہارے لیے آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتا ہوں اور تمہاری مانگ میں افشاں کی طرح انہیں سجا سکتا ہوں۔ اگر حکم کرو تو دہکتے انگاروں پر چل کر دکھا سکتا ہوں اور بے دھڑک آگ کے دریا میں کود سکتا ہوں۔ تمہارے ایک اشارۂ ابرو پر اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر سکتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔۔

جہاں تک بیوی کا معاملہ ہے بیوی گوری چٹی ہو کہ سانولی سلونی، فربہی مائل ہو کہ صنفِ لاغر اور قدامت پسند ہو کہ فیشن ایبل، اس سے اظہار عشق میں کچھ الفاظ کی الٹ پھیر کرنی ہوگی۔ ہم جیسے ہیچ مداں کا مقولہ ہے کہ عورت چاہے روکھی پھیکی ہو مگر بہر حال تعریف کی حد درجہ بھوکی ہوتی ہے۔ اسے چند لفظوں کی تھوڑی سی تعریف میں رام کیا جا سکتا ہے۔ یعنی 'بن پھیرے ہم تیرے' کو مارو گولی اور اپنے جیون ساتھی کو بناؤ عشق کی ہم جولی۔ گھر آنگن کو جنت کدہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ کبھی کبھار اپنی نصف بہتر کو بھی بہتر لفظوں سے نوازیں اور بہت جذباتی انداز میں اپنے عشقیہ خیالات کا دوبدو اظہار کریں۔ ہم تو سدا کے بیوی کے مارے ہیں۔ عشق کے پرکالے ہیں۔ جب بھی موقع ومحل ہوتا ہے ہم ریڈیو کی طرح یوں چالو ہو جاتے ہیں:

''پیاری ...... میرے دل کی رانی، گھر کی مہارانی۔ تم کتنی اچھی ہو، سچ مچ میرے لیے حور بہشتی ہو...... تمہارے پھول سے

چہرے کا نکھار، دور کردیتا ہے میرے دل سے رنج وغم کا غبار۔ اف! یہ ڈل جھیل جیسی خوبصورت نشیلی آنکھیں، میں ان میں کود کر ڈوب جاؤں کہ دل شکارے کو تیراؤں ...... ہائے یہ صندلی بانہیں! جی چاہتا ہے کہ زندگی بھر بنا کھائے پیے ان کی آغوش میں پڑا رہوں اور کہتا رہوں کہ میرے محبوب تم ہو بہت خوب ...... یہ لانبی لانبی الجھی زلفوں کی بھینی بھینی مہک کہتی ہے کہ تاحین حیات ان کے گھنے سائے میں ٹانگیں پھیلائے پڑا رہوں، نوکری ڈیوٹی پر بھی نہ جاؤں۔ کیا قیامت کے ہیں یہ گلگوں رخسار، یہ پیارے پیارے یاقوتی لب، یہ مصری میں گھلے میٹھے بول۔ تم بولتی ہو تو تمہارے سر کی قسم مجھے ایسا لگتا ہے کہ کوئل اپنی سریلی آواز میں میرے دل کے آنگن میں کوک رہی ہو...... اور پھر کیا غضب کی ادائیں ہیں کہ ہر ہر ادا پر میرا دل ناداں کلا بتو ہوا جاتا ہے۔ سچ مچ تم نے میری جھونپڑیا میں آکر میرے جیون میں دو دونی چار نہیں، چار دونی آٹھ چاند لگادیئے ہیں۔ تم جوان العمر رہو ہزاروں سال، اسی طرح کرتی رہو مجھے خوشیوں سے نہال......''

ممکن ہے کہ آپ میں سے کچھ حضرات بیوی ہولڈر نہ ہوں اور ہونقوں کی طرح سوال کر بیٹھیں کہ لائف پارٹنر کی عدم موجودگی میں ہم پر عشق کا دورہ پڑ جائے تو ہم کیا کریں اور کس سے زانوئے عشق تہہ کریں۔ اس میں گھبرانے کی بات نہیں اگر آپ کے پاس بیوی نہیں ہے تو کسی مالدار بیوہ کے ساتھ عشق کا ناٹک رچائیں۔ ارے بھئی! یہ بے تکا مشورہ نہیں۔ بیوہ عورت خیر سے تجربہ کار ہوتی ہے اور اگر وہ مالدار ہے تو کھلائے گی، پلائے گی اور مفت میں عشق کے آداب بھی سکھلائے گی۔ آخر میں ایک فارسی کا شعر ملاحظہ ہو:

فیضی احسنت ازیں عشق کہ دوراں امروز
گرم دارد زِتو ہنگامۂ رسوائی را

اگر آپ فارسی میں کورے ہیں اور اردو میں بھی ادھورے ہیں تو ڈبلیو ڈبلیو ڈبلیو ڈاٹ یو آر ڈی یو پر رجوع کریں ورنہ ہم سے رابطہ قائم کریں۔

☆......○......☆

نشتر امروہوی

میں روزے سے ہوں

کون کرتا ہے یہاں انکار میں روزے سے ہوں
جس کو دیکھو کہہ رہا ہے یار میں روزے سے ہوں

رات کو سحری اُڑائی دن میں چُھپ کر کھالیا
شام کو مسجد میں ہے افطار میں روزے سے ہوں

صبح سے آفس میں چِک چِک دوپہر اولاد سے
شام کو بیگم سے ہے تکرار میں روزے سے ہوں

آج افطاری میں اسپیشل ہے ڈش کا انتظام
آ نہ جائے کوئی رشتے دار میں روزے سے ہوں

کیوں الیکشن رکھ دیا رمضان کے ایام میں
ووٹ ڈالوں کس طرح سرکار میں روزے سے ہوں

کل تو روزہ ٹوٹ ہی جاتا پڑوسن کے سبب
اس طرح کرتی ہے وہ سنگھار میں روزے سے ہوں

کاٹ ہی لیتے ہیں دن آفس میں ہم جھک مار کے
اور نشتر آج ہے اتوار میں روزے سے ہوں

......☆......

محمد رفیع انصاری
تھانے (مہاراشٹرا)

تھیلی

آدمی کے بازار سے رشتے کو مضبوط کرنے میں جو نازک سی شئے اہم کردار ادا کرتی ہے اُسے 'تھیلی' کہتے ہیں۔ منڈی جاتے وقت شرفا اپنے جیب و دامن کی خبر لینے سے پہلے 'تھیلی' کی خبر گیری ضروری خیال کرتے ہیں۔ تھیلی سے بازار کا ناتا ایسا ہی ہے جیسا پتنگ کے ساتھ ڈور کا۔ جو باکمال رشتہ و پیوند کو خاطر میں نہیں لاتے انھیں بھی بازارِ خورد سے تعلق رکھنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ ایک فٹ چوڑی اور سوا فٹ لمبی تھیلی آدمی میں خود اعتمادی پیدا کرتی ہے۔ ساتھ ہی یہ من پسند اشیائے جنس کو رکھنے (اور چھپانے) کے کام بھی آتی ہے۔

تھیلی کی کئی قسمیں ہیں۔ پہننے کے کپڑے میں سِلی ہوئی تھیلی کو 'جیب' کہتے ہیں۔ دل سے قریب رہنے والی جیب آدمی کی خبر ونظر میں رہتی ہے۔ پیرہن کے دائیں بائیں والی جیبوں سے صرفِ نظر کرنا خاص لوگوں میں بہت عام ہے۔ اس لیے یہ جیبیں اپنی نہیں دوسروں کی (بُری) نگاہ میں ہوتی ہیں۔ سفر اور بھیڑ بھاڑ میں ان جیبوں پر ہاتھ صاف کرنے کا چلن پہلے سے اب کہیں زیادہ ہوگیا ہے۔ ایسی جیبوں کو 'تراشنا' آسان ہوتا ہے۔ یہ تراش اس غضب کی ہوتی ہے کہ (بیشتر معاملات میں) صاحبِ جیب کو کوئی 'خراش' نہیں آتی۔ تراش خراش کا یہ عمل انجام دینے والا 'جیب تراش' کہلاتا ہے۔ اُسے ہر طرح کی جیبوں کو کاٹنے کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ واقف کار کہتے ہیں کہ جیب کاٹنے کے ٹریننگ اسکول کے لیے کسی اشتہار کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بغیر اتہ پتہ رکھنے والے اس 'تربیت گاہ' میں داخلہ فیس اور ڈونیشن کی بھی کوئی خبر نہیں۔ غرض کہ اس باب میں سارا کام بڑی راز داری اور ہوشیاری کا متقاضی ہوتا ہے۔

آپ نے ایسے اصحاب بھی دیکھے ہوں گے جو اپنی پوشاک میں دو تین جیبوں سے قطعی مطمئن نہیں ہوتے۔ چنانچہ اپنے اطمینان کی خاطر اپنے لباس میں درزی سے مخصوص جیبوں کا اضافہ کرواتے ہیں۔ یہ جیبیں، عوام کی حیرانی کا باعث تو ہوتی ہی ہیں لیکن سب سے زیادہ یہ جیب کتروں کی پریشانی کا سبب بنتی ہیں۔ ان جیبوں میں کچھ ڈھونڈنا اوروں کا کیا مذکور خود ان کے لیے ایک چیلنج ہوتا ہے۔ ایسے لوگ خود ہی اپنی 'تلاشی' لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جامہ تلاشی کا یہ منفرد انداز متلاشی کے لیے جائے عبرت اور تماشائیوں کے لیے موجبِ تفریح ہوتا ہے۔

سربراہانِ مملکت کے لباسوں اور جیبوں کا معاملہ قدرے مختلف ہے۔ حکمرانوں کے پہناوے ان کے ذوق کی نہیں بلکہ ان کی رعایا کی حالت کی عکّاسی کرتے ہیں۔ غیر ملکی دورہ کرنے والے یہ حاکم ہاتھ میں ہاتھ دیتے تو نظر آتے ہیں لیکن کبھی اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے۔ دراصل ان کی جیب سرکاری خزانے کی طرح خالی ہوتی ہے۔ ان کے اخراجات کا بار انہی کی جیبوں پر پڑتا ہے جن کی جیبیں پہلے ہی سے تنگ ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان دنوں عامۃُ الناس کی جیب تراشنے کا کام کشادہ بازاروں سے کشادہ دل حکمرانوں کی منصوبہ سازیوں تک ایسا پھیل گیا ہے کہ اس کے اور چھور کو کچھ اندازہ نہیں۔

تھیلی کی ایک قسم بٹوا بھی ہے۔ جیبی تھیلی کو 'بٹوا' کہتے ہیں۔ جب معاشرے میں دولت بٹورنے کی بیماری عام نہ تھی اُس وقت شرفا سفر وحضر میں بٹوے کا استعمال بے خطر کیا کرتے

تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ بٹوے کے پیٹ سے زیادہ اُس کا 'منہ 'پسندِ صغیر و کبیر رہا ہے۔ کسی کے منہ کو 'بٹوا سا منہ' کہنے کا 'صاحبِ جمال' بُرا نہیں مانتے۔ اسے بالغ نظر 'غنچہ دہن' کہتے ہیں۔ بہت پڑھے لکھے بند بٹوے کو 'غنچۂ نا شگفتہ' کہتے ہوئے بھی سنا جاتا ہے۔ بٹوے کے طرف دار قناعت پسند اور ہر حال میں راضی برضا رہنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ بٹوا اُڑانے والے کو اُس وقت بڑی خفت اُٹھانی پڑتی ہے جب بٹوے میں سے 'تلاشِ بسیار کے بعد محض چھالیا' برآمد ہو۔ ایسا سرزد ہونے پر جیب کترے کی حالت دیدنی ہوتی ہے۔ اُس کا بس چلے تو وہ صاحبِ بٹوا کو بٹوے کے ساتھ ہی چبا جائے۔ بے چارہ بٹوے کا رمز کیا جانے؟

بٹوے کی ایک شاخ 'پریوی پرس' (Privy Purse) بھی ہے۔ اسے شاہی بھتّہ کہتے ہیں۔ آزادی سے قبل ہمارے ملک میں بے شمار چھوٹے چھوٹے حکمراں اپنی برائے نام مملکت کے ساتھ پورے ملک میں پھیلے ہوئے پھل پھول رہے تھے۔ آزادی کے بعد وہ سب کے سب برضا و رغبت بھارت میں ضم ہوگئے۔ ان کے مدغم ہونے کا یہ انداز وطن دوستی کی علامت سمجھا گیا۔ اس لیے سرکار نے ان حاکموں کی بساط کے مطابق ان کے آنسو پونچھنے کے لیے انھیں تاحیات بھتّہ دینا طے کیا۔ اس بھتّے کو خفیہ بٹوا 'یا صَرف خاص کا نام دیا گیا۔ ہماری سرکار نے ایسے ۵۶۲ شاہی خاندانوں کو کچھ رقم بھتے کے طور پر مقرر کی۔ کہتے ہیں کہ 'صرفِ خاص' کی یہ رقم پانچ ہزار سے لے کر پانچ لاکھ روپے سالانہ تھی۔ مگر یہ بھتّہ نام نہاد حکمرانوں کے لیے 'رائی' جیسا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں سرکار نے جب اس خفیہ بٹوے کا منہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا تو یہی 'رائی'، متعلقین پر 'پہاڑ' بن کر گری۔

مقامِ مسرّت ہے کہ جن لوگوں کو جیبی تھیلی (بٹوا) رکھنے کی عادت ہے۔ وہ کپڑے کی تھیلی کی اہمیت خوب سمجھتے ہیں۔ کپڑے کی تھیلی کے ساتھ بازار نکلنے کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ آنے جانے والے ایسے آدمی کو 'فرض شناس' خیال کر کے اس کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کپڑے کی تھیلی میں رکھے جانے والے سامان اپنی چھاپ چھوڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بازار کی تھیلیوں کے داغ دھبّے، دل کے داغوں کی طرح عزیز ہوتے ہیں۔ یہ مٹانے پر بھی نہیں مٹتے۔ اس لیے شرفا ان سے زیادہ چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے۔ جو لوگ بازار میں اپنی تھیلیوں سے پہچانے جاتے ہیں، وہ تھیلیاں درحقیقت کپڑوں ہی کی ہوتی ہیں۔ تھیلیوں میں کپڑے کی تھیلی کا وہی مرتبہ ہے جو کارواں میں سالارِ کارواں کا ہوتا ہے۔ پرانے وقتوں کے لوگ اس بندھن کو قائم و دائم رکھنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ اس لیے گھروں میں پرانے سکّوں، پرانے برتنوں کے ساتھ ساتھ ایک عدد کپڑے کی تھیلی بھی یادگار کے طور پر رکھی جاتی ہے۔

تھیلی کو گھر میں کس جگہ رکھا یا ٹانگا جائے بیشتر گھرانوں میں آج بھی یہ ایک مسئلہ ہے۔ جن گھروں میں تھیلی، موبائل، عینک (اور برسات کے دنوں میں چھتری) رکھنے کی کوئی معیّن جگہ نہیں ہوتی ان گھروں میں یہ اشیاء غیر معیّن جگہوں پر نظر آ کر اپنی اور صاحبِ خانہ کے 'انتظامِ صفائی' پر سوالیہ نشان لگاتی نظر آتی ہیں۔ خالی تھیلی تحفتہً دینے کا رواج نہیں ہے۔ اس تھیلی گزیدہ دور میں اگر 'خیر اندیش' سوغات کے طور پر خالی تھیلی عامۃ الناس میں تقسیم کریں تو اس سے 'سرو کاروں اور سرکاروں' دونوں کی مدد ہوگی۔

خالی تھیلی چوری ہونے کے معاملات قدرے کم ہوتے ہیں۔ البتہ بھری تھیلی کا معاملہ اور ہے۔ الیکشن کے دنوں میں تھیلی پہنچانے کے واقعات (ترقی پذیر ممالک میں) کثرت سے ہوتے ہیں۔ پہنچانے والی تھیلی کو 'جھولی' بھی کہتے ہیں۔ جھولی پھیلائی بھی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں الیکشن میں جھولی پہنچانے کے ساتھ ساتھ جھولی پھیلانے کا بھی رواج ہے۔ بار بار جھولی پھیلانے کا نقصان ایک ہی ہے۔ اس سے جھولی میں 'سوراخ' ہو جاتا ہے۔ سوراخ والی تھیلی پھیلائی نہیں جاتی۔ بقول شاعر

جس جھولی میں سو چھید ہوئے اُس جھولی کا پھیلانا کیا؟

بازار سے لوٹتے ہوئے کسی آدمی سے یہ سوال نہیں پوچھا جاتا کہ 'تھیلی میں کیا ہے؟' تھیلی کا معاملہ 'بند مٹھّی' سے الگ ہوتا ہے۔ بند مٹھّی خاک کی ہوتی ہے یا راکھ کی۔ مگر تھیلی کا بھید تھیلی والے کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ تھیلی میں کیا کیا ہوتا ہے؟ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ وجہ ایک ہے۔ سامانِ خورد ونوش کی فہرست بڑی طولانی ہوتی ہے۔ جن گھر والیوں کا کثرت کار کی وجہ سے ذہن کام نہیں کرتا انھیں بار بار منڈی سے رجوع ہونے کے لیے کسی بھروسے کے آدمی کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ بھروسے کا یہ آدمی کون ہوسکتا ہے وہ سب جانتے ہیں۔۔ سلامت پسند لوگ ایک ہی دن میں کئی مرتبہ تھیلی کے ساتھ منڈی کا رُخ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا، لیکن منڈی میں روز کا آنا جانا قدر و منزلت بڑھاتا ہے۔ آدمی ٹھگے جانے سے بچنے کے علاوہ ٹھگ لیے جانے والوں کی رہنمائی کے کام بھی آتا ہے۔ گوشت اور مچھلی کی پہچان بازار کا چکّر لگانے والوں کو جتنی اچھی ہوتی ہے اتنی رنگروٹوں کو نہیں ہوتی۔

ہم نے جنابِ سدّ وسے دریافت کیا کہ 'عالی جناب! پلاسٹک کی تھیلیوں کی مقبولیت کے کیا اسباب ہیں؟ فلسفیانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولے ''پلاسٹک کی تھیلی غیبی بھی ہے اور عیبی بھی۔ پلاسٹک کی دھنک رنگ تھیلیوں نے پاکیزگی، صفائی اور طہارت میں رنگ کم، مگر 'زنگ' زیادہ لگایا ہے۔ یہ سیاہ تھیلیاں سیاہ سفید کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ سب سے زیادہ نیک نامی پلاسٹک کی سیاہ تھیلیوں کے حصّے میں آئی ہے۔ بازارِ خورد میں اس کا 'بازاری' ہونا طشت از بام ہو چکا ہے۔ اب اس کو اپنے پاس رکھنا ریل میں بلاٹکٹ سفر کرنے کے مترادف ہے۔

میں نے عرض کیا 'محترم وہ سب تو ٹھیک ہے۔ پلاسٹک کی تھیلی کا 'عیبی' ہونا بھی ثابت ہوگیا ہے۔ لیکن اسے آپ نے 'غیبی' کیوں کہا ہے؟۔۔۔ میری بات سن کر زور سے ہنسے اور پھر بولے 'برخوردار ہمارے ہر محلّے کی دو بلڈنگوں کے درمیان والی سنسان گلی میں تمھیں پلاسٹک کی بھری تھیلیوں کے انبار دکھائی دیں گے۔ یہ تھیلیاں نامعلوم جگہ سے وہاں پھینکی جاتی ہیں۔ اس لیے میں نے اسے 'غیبی' کہا ہے۔ اس (بھری) تھیلی کا عیب یہ ہے کہ کوئی اسے اپنے پاس رکھنا گوارا نہیں کرتا۔ ''برتو اور پھینکو' اس کی سرشت میں شامل ہے۔ اسے برتنے سے پہلے ہی پھینک دینے میں عافیت ہے۔ یہ مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔۔

محمد رفیع انصاری۔ mobile...9527421695
Al.Madni ...734 Bhusar Mohalla
,BHIWANDI (421308)
Dist. Thane. M.S.

☆......○......☆

قلم کار اپنی تخلیقات صرف ''ان پیج فارمیٹ'' میں ہی ای میل کریں۔ 'ورڈ' یا 'کنورڈ' کی فائل ارسال نہ کریں

کمپیوٹر کتابت وطباعت
ISBN کے ساتھ
رابطہ قائم کریں
SAM کمپیوٹرس
موبائیل: 9246 54 3027
99 4 88 99 196
ای میل: samurdu@yahoo.com
m_basharath@yahoo.com
مغل پورہ، حیدرآباد۔ تلنگانہ

(ڈاکٹر) محمد یحییٰ جمیل
امراوتی (مہاراشٹرا)

فنا فی الشعر

پیران پیر حضرت مشتاق احمد یوسفی صاحب نے فرمایا تھا:

غزل، کھا گئی نوجواں کیسے کیسے

لیکن آج منظر نامہ یہ ہے کہ:

غزل کھا گئے، نوجواں کیسے کیسے

حکمائے قدیم نے مرضِ تک بندی کا اہم سبب، یکطرفہ محبت بتایا ہے، اور مرض مشاعرہ بازی کا سبب، بغیر کام کیے شہرت و دولت کی ہوس۔ راجا راشدی صاحب، طایفۂ ثانیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندو اساطیر کے مطابق، وشنو کے پانچویں اوتار، وامن نے دو قدموں میں زمین اور آسمان ناپ لیے تھے، یہ بھی دو قدموں میں دونوں دنیائیں حاصل کر لینا چاہتے ہیں! وامن اوتار نے تیسرا قدم راجا بلی کے سر پر رکھ کر اسے سورگ لوک پہنچا دیا تھا۔ آجکل یہ بھی تیسرا قدم شاعری کے سر پر رکھ کر اُسے جنت مکانی کرنے سے باز نہیں آتے۔

موصوف کوئی بے پڑھے لکھے شخص نہیں ہیں؛ بے قاعدگی سے سول انجینئر نگ کی ہے۔ صرف ادب نہیں پڑھا، تو اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟ جب انجینئر نگ کے سہارے دو جون کی روٹی کا انتظام ہونا مشکل ہوا تو مشاعرے میں ڈول ڈالا اور ماشاء اللہ کامیاب رہے۔

اس کا قصہ یوں ہے کہ ایک دن کرانہ کی دکان پر انھیں قسمت کی چابی مل گئی۔ لالا جی نے بوسیدہ بیاض دیتے ہوئے کہا، ''انجینئر صاحب دیکھیے، ردّی میں اردو کی ایک کتاب آ گئی ہے۔'' موصوف نے بادلِ ناخواستہ ورق گردانی کی تو پایا کہ اس میں غزلیں مرقوم ہیں۔ دماغ کی بتی جل گئی اور اُسی شام شاعر بن کر احباب کے حلقے میں ایک غزل سنا دی۔ زبردست داد ملی تو حوصلہ بڑھ گیا۔ فوراً مشاعرے کے بروکر سے ملے، کچھ نذرانہ پیش کیا کہ سرمایہ کاری، تجارت کی پہلی شرط ہے۔ منتظمین نے اگلے مشاعرے میں پڑھنے کا موقع دیا اور چند لڑکے مقرر کر دیے۔ ان کا کام یہ تھا کہ ہر شعر پر دادیں اور غزل ختم ہونے پر دوڑ کر ہار پہنائیں۔ سب کچھ منصوبہ بند طریقے سے ہوا، اور راشدی صاحب کامیاب رہے۔ اس کے بعد انھوں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ مالِ مفت، دل بے رحم۔ جوشِ ہوس میں رفتہ رفتہ ساری غزلیں سنا دیں اور خالی ہو گئے۔ اب انھیں کم از کم چار پانچ بار استعمال کرنے کے لیے ایک نئی نویلی غزل تو چاہیے ہی تھی۔ لہٰذا معاملہ یہ رہا کہ خریدی جا سکے تو ٹھیک، اغوا کی جا سکے تو ٹھیک ترین۔

ایک شام دوڑے دوڑے تشریف لائے کہ ایک مطلع ہوا ہے، ملاحظہ فرمائیں۔ ان کے چہرے کی چمک بتا رہی تھی کہ آج لاولدی کا داغ مٹ گیا۔ ہمارے ارشاد کہنے سے پہلے ہی فرمایا:

وہ بڑی فرصتوں سے بنائے گئے
ہم بڑی عجلتوں سے بنائے گئے

ہم نے کہا، ''اگر مصرعِ ثانی میں بنائے کے ب کی جگہ ج کر دیں تو......؟'' فوراً قلم نکال کر اصلاح کی اور یہ جا وہ جا۔ ہم آواز دیتے رہ گئے۔ پھر مشاعرے میں مذکورہ اصلاح کے ساتھ اپنا مطلع پڑھ کر عذابِ دارین حاصل کیا۔

اگلی ملاقات میں بہت روٹھے روٹھے تھے کہ 'آپ نے مجھے رسوا کر دیا۔' ہم نے دیڑھ منٹ کھانس کر، نامعقول جواب سوچا

اورعرض کیا، ''راشدی صاحب، عوام جاہل ہے۔ آپ نے کمال کا شعر کہا ہے، اس میں تخلیق شعر پر ڈسکورس ہے۔ آپ کا شعر کہہ رہا ہے کہ دوسرے شعرا اپنے اشعار بناتے ہیں۔ جیسے ٹیبل، کرسی وغیرہ، یعنی ان کے اشعار بناوٹی ہوئے۔ جبکہ ہم جنائے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہم ذی نفس ہیں، زندہ ہیں۔ فرصتوں اور عجلتوں میں صنعت تضاد بھی ہے، جو شعر کے معنوں میں اضافہ کا باعث ہے۔ وہ فرصتوں کے باوجود بناوٹی اور ہم عجلتوں کے باوجود زندہ، کمال کا شعر ہے!''

راشدی صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور ہمارے ہاتھ چوم کر بولے، ''ایک آپ ہی بندہ کو سمجھتے ہیں۔'' اس کے بعد انھوں نے کنواری غزلوں کی تلاش چھوڑ دی۔ اس طرح یتیم اور بیاض نشین غزلوں کو ان کے غنا بالجبر سے امن نصیب ہوا۔

پھر ہر دو چار روز بعد ایک سر جھاڑ منھ پہاڑ غزل بنا کر لے آتے کہ ایک نظر دیکھ لیجیے۔ حکومت اگر بے وزن شاعری پر چالان شروع کردے تو کروڑوں روپئے سرکاری خزانہ میں جمع ہوسکتے ہیں اور ہم اس کارِ نیک کے لیے مخبری جیسا پوچ کام کرنے کو بھی تیار ہیں۔ خیر، غازہ مسی سے کیا کام بنتا، سرجری کرنی پڑتی اور ہم جونہی غزل کی پلاسٹک سرجری سے فارغ ہوتے، وہ فوراً اسے دوسرے کاغذ پر نقل کرتے اور تصحیح شدہ پرچہ پرزہ پرزہ کرکے پھینک دیتے۔

مقام شکر ہے کہ کچھ عرصہ بعد راشدی صاحب کو ایک وظیفہ یاب ہیڈ ماسٹر کا سہارا مل گیا اور وہ اُن سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب، میر، غالب اور اقبال کے نام ہی سے چڑتے ہیں کہ اردو والوں کو ان کے علاوہ کوئی شاعر دکھتا ہی نہیں۔ ان کی صحبت میں، سنا ہے پچھلے دنوں راشدی صاحب بھی اعلان کرچکے ہیں کہ اگر جامعات میں ان شعرا پر تحقیق بند نہ ہوئی تو ہم فسادات پر شعر پڑھنا بند کردیں گے۔

راجا راشدی صاحب اب مسلسل ہوٹ ہونے لگے تھے۔ نیا لطف یہ ہوا کہ مشاعرہ میں ایک نوجوان، اپنی شال میں کتے کا پلّا چھپا کر لایا۔ جونہی راشدی صاحب نے شعر پڑھا، پلّے پر دھپ جمادی گئی۔ پلّا زور سے چیخا۔ اور راشدی صاحب کے ہر مصرعے پر چیختا رہا یہاں تک کہ سامعین ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئے۔

اس حادثہ سے راشدی صاحب کی آزردہ خاطری میں اضافہ ہوگیا۔ گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ پھر ایک دن ڈان کیہوٹے (Don Quixote) کی کھوپڑی میں نیا منصوبہ آگیا۔ ریاکاری کا چمن فصل خزاں سے مامون رہتا ہے، لہٰذا از سرِ نو حصولِ عزت کے لیے 'حاجی صاحب' بن جانا لازمی ٹھہرا۔ کسی طرح عمرہ کر آئے اور داڑھی ٹوپی کے ساتھ مشاعرہ پڑھنے لگے۔ یہ ہتھیار مؤثر ثابت ہوا اور لڑکوں نے ہوٹ کرنا بند کردیا۔

بہرکیف اب وہ علامہ بن چکے ہیں اور وقتاً فوقتاً اپنی استادی کا ثبوت بھی مہیا کرتے ہیں۔ ایک بار ہمارے ایک دوست نے کسی بات پر مصرع نقل کیا:

ہمیں یاد سب ہے ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

بولے، ''صاحب، شعر کہتے وقت دماغ حاضر ہونا چاہیے۔ اگر سب یاد ہے تو ذرا ذرا کہنے کی کیا ضرورت ہے۔'' اور اس سے پہلے کہ ہم وضاحت کرتے کہ کم از کم اس معاملے میں وہ بے خطا ہیں، راشدی صاحب نے اصلاح فرمادی:

ہمیں یاد ایک ایک بات ہے تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اور فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ ہماری جانب دیکھنے لگے۔ ہمارے دوست نے انتہائی تشکر کے ساتھ پوری غزل لکھ کر پیش کردی کہ حضور غزل ہی کی اصلاح فرمادیں۔ انجینئر صاحب نے غزل لی اور دس منٹ میں پوری غزل کا رِنوویشن کردیا۔ اصلاح کرتے ہوئے درس بھی جاری رہا، مثلاً

وہی وعدہ یعنی نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

بولے، ''بھئی نباہ تو تب ہوگا جب نکاح ہوجائے۔ کیا، لیو اِن رلے شن شپ کے حامی ہیں آپ؟'' پھر قہقہہ لگا کر فرمایا، ''یوں کیجیے:

وہی وعدہ یعنی 'نکاح' کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو''

راشدی صاحب، بنت العنب کا تذکرہ سنتے سنتے اور تذکرہ کرتے کرتے، ایک دن ایسے بیتاب ہوئے کہ اسے ہونٹوں سے چھو ہی لیا۔ پھر اس کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر ہفتے میں دو تین بار کسی بار کے باہر پڑے ملتے۔ ہم نے عرض کیا، ''آپ عمرہ کر آئے ہیں، کیا یہ منظر اچھا لگتا ہے؟''

فرمایا، ''میں بھی سوچتا ہوں کہ عمرہ ذرا جلدی ہو گیا۔''

پھر یہ افواہ اڑی کہ موصوف کسی مطلقہ شاعرہ سے عشق بھی فرما رہے ہیں اور آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے۔ سو، ملاقات ہوتے ہی دریافت کیا تو بولے، ''قسم لے لیجیے، یہ محض تہمت ہے۔'' ہم نے کہا، ''پھر آپ تردید کیوں نہیں کرتے؟'' قدرے شرما کر ارشاد عالی ہوا، ''کیا ایسے حسین الزام کی تردید کی جانی چاہئے؟''

ان دنوں وھاٹس ایپ پر آفتابِ عالم تاب بنے ہوئے ہیں۔ پچیس تیس گروپ بنا رکھے ہیں، جن میں کچے لیموں راجا راشدی صاحب کے لیے لگاتار توصیفی کلمات پوسٹ کرتے ہیں۔ 'کچے لیموں' دراصل وہ اپنے شاگردوں کو کہتے ہیں، اور اُن سے برائے اصلاح، فی شعر دس روپئے وصولتے ہیں، اور شاگرد، ۲۴x۷ اُن کی خدمت میں متحرک الانگشت رہتے ہیں۔ بلکہ ایک ترش، تو محض اس وجہ سے ہمیں سلام نہیں کرتا کہ ہم نے اس کے گروپ، 'راجا راشدی فین کلب' سے ایگزٹ کر لیا تھا۔

قصہ مختصر راجا راشدی صاحب فنا فی الشعر شخص ہیں۔ وہ جماہی لیتے ہیں تو 'رباعی' اور چھینکتے ہیں تو 'ہائیکو' سنائی دیتا ہے۔ ایک مرتبہ انھیں ہچکی لگی تو ہم نے صاف سنا، 'قطعہ قطعہ قطعہ قطعہ' کہہ رہے تھے۔

ڈاکٹر یحییٰ جمیل
بیت الجلیل-۹ ، اسیر کالونی
پوسٹ وی ایم وی ، امراوتی ۴۴۴۶۰۴ (مہاراشٹر)

☆......○......☆

ہنس مکھ حیدرآبادی
7013351543

غزل

برتھ ڈے اہلیہ کا منایا کرو
کیک پر کم ہی کینڈل جلایا کرو

پر سکوں زندگی کی طلب ہو اگر
اہلیہ کے فقط گیت گایا کرو

شعر سن کر جو ہنستے نہیں سامعین
درمیاں میں لطیفے سنایا کرو

شعر فہمی کو مشکو رہنے نہ دو
گاہے ماہے سہی سر ہلایا کرو

سیر و تفریح پر بھی لگا ٹیکس ہے
اب ہنی مون گھر پر منایا کرو

تم زمانے میں مشہور ہو جاؤ گے
ہر جگہ ٹانگ اپنی اڑایا کرو

جب ولیمے کی دعوت کرو تم قبول
ناشتہ کر کے کچھ بھی نہ کھایا کرو

واقعی جانچ جس کی نہ مطلوب ہو
جانچ پر اک کمیشن بٹھایا کرو

جتنے قاتل تھے سارے بَری ہو گئے
اب گواہوں کو پھانسی چڑھایا کرو

ہے یہ ہنس مکھ کا انداز طنز و مزاح
ہے پسند آپ کو تو بتایا کرو

عمر حنیف
کھیم گاؤں مہاراشٹرا
8983620554

ناک

ناک !...... ناک کو جسمانی اعضا میں وہ برتری حاصل ہے جو سماج میں ایک طرح سے شرفا کو حاصل ہوتی ہے ۔ شرفا کی ناک سماج اور سوسائٹی دونوں میں ہمیشہ اونچی ہوا کرتی ہے ۔ یہ وہ ناک ہے، جسے شرفا اپنے اسٹیٹس کے طور پر استعمال کرتے ہیں، کچھ شریف تو ناک نہ ہوتے ہوئے بھی شریف کہلاتے ہیں ۔ ان دنوں ہمارے پڑوسی ملک کے 'شریف' کے بڑے چرچے ہیں ۔ یہ جناب شریف ہی نہیں بلکہ مکمل شریف ہیں ۔ انہیں ان کی شرافت کے عوض پورے دس سال کی سزا سنائی گئی ہے ۔ واقعی کسی شریف کی شرافت ہو تو ایسی ! کمال تو یہ ہے کہ سزا کا طوق گلے میں لٹکا ہوا ہونے کے باوجود ابھی بھی یہ شریف ہی کہلائے جارہے ہیں ۔ اللہ ایسی شرافت کسی کو عطا نہ کرے ۔۔

مرد کے چہرے پر ناک کی بجائے ناک جیسی چیز ہو تو بھی وہ 'ناک' ہی کہلاتی ہے ۔ البتہ ذات نسواں کے لیے ناک کی ساخت کافی اہمیت رکھتی ہے ۔ 'ناک' کی تھوڑی بھی اونچ نیچ نسوانیت کی خوبصورتی کا سارا کھیل بگاڑ دیتی ہے ۔ جب بھی لڑکے والوں کی طرف سے منی بارات کی شکل میں جو قافلہ 'لڑکی' کو دیکھنے پرکھنے، اورل اور فزیکل ٹسٹ لینے آتا ہے، ان کی نظریں، لڑکی کے رنگ وقد وقامت سے گذر کر سیدھے 'ناک' پر آکر ٹھہرتی ہیں ۔ اگر لڑکی کی ناک صحیح ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ لڑکی نے پہلا امتحان پاس کرلیا ہے ۔ اس کے بعد رنگ روپ کی بات ہوتی ہے ۔ پہلے سیرت کو خاص اہمیت دی جاتی تھی، کہا جاتا تھا کہ لڑکی کی صورت نہیں، سیرت اچھی ہونی چاہئے ۔ لیکن اب لڑکی کی سیرت سے لڑکے والوں کو کوئی لینا دینا نہیں ہوتا ۔ کہتے ہیں 'سیرت کی ضرورت پچھلی صدی کے لوگوں کو ہوا کرتی تھی ۔ لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے ۔ اب زمانہ ہائی ٹکنالوجی کا ہو چکا ہے ۔ اچھی سیرت بنانے اور بگاڑنے کے لیے بازار میں این رائیڈ فون موجود ہیں ۔ گھر میں ٹی وی سیٹ موجود ہیں، جس پر چوبیس گھنٹے ایسے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں، جو سیرت کو کیا؟ پورے گھر کی صورت بگاڑنے کے لیے کافی ہوتے ہیں ۔ محاوروں میں ناک کو ایک خاص مقام حاصل ہے ۔ 'ناک کٹنا' ...... 'ناک لگانا' ...... 'ناک میں دم لانا' ...... 'ناک کاٹنا' (اپنی نہیں دوسروں کی)، ناک کٹنے ...... اور ناک کاٹنے میں بڑا فرق ہوتا ہے ۔ اس دور میں اپنے ہاتھوں خود کی ناک کوئی نہیں کاٹتا ۔ اور یہ دور تو اس قدر شورش زدہ ہے کہ کب کسے موقع ہاتھ آتا ہے اور وہ دوسروں کی ناک کاٹنے میں کامیاب ہوتا ہے؟

گاؤں میں رحیمن خالہ کی طوطی بولتی تھی ۔ بڑا مہذب گھرانہ تصور کیا جاتا تھا ۔ گاوں میں کسی کی کیا مجال کہ وہ رحیمن خالہ یا پھر ان کے خاندان کو کوئی ناک لگائے ۔ البتہ انہیں اختیار تھا کہ وہ گاؤں میں کسی کو بھی 'ناک لگا سکتی تھیں ۔ لیکن یہ قدرت کا نظام ہے کہ ناک لگانے والوں کی ایک دن ناک ضرور کٹتی ہے ۔ ایسے ہی ایک دن رحیمن خالہ کی ناک کٹ گئی ۔ معلوم ہوا کہ ان کی بیٹی نے گھر سے بھاگ کر کسی سے شادی کرلی ۔ سماج میں گھر سے بھاگنے کے عمل کو شریفوں کا شیوہ نہیں سمجھا جاتا ۔ اسی لیے ہر وہ کام جو سماج و روایتوں کے خلاف انجام دیئے جاتے ہیں، وہ سماج اور خاندان کی ناک کٹنے کے مترادف سمجھے جاتے ہیں ۔

ناک کی ایک اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ جانداروں کے

علاوہ سماج و خاندانوں کی بھی ناک ہوتی ہے، جو بظاہر تو نظر نہیں آتی لیکن ہوتی ضرور ہے۔ اس ہونے کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب یہ کٹ جاتی ہے۔!

پچھلے کئی دنوں سے آدھار کارڈ کو ہر چیز سے جوڑنے کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ حکومت کسی ضدی بچے کی مانند بضد ہے کہ آدھار کو انسانوں کی روزمرہ کی کارکردیوں سے جوڑا جائے۔ بلکہ مویشیوں سے بھی جوڑا جائے۔ ہمارا تو حکومت کو مشورہ ہے کہ اسے انسانوں اور خاندانوں کی ناک سے بھی جوڑا جائے، تا کہ رشتوں کی آرزو میں دربدر بھٹکتے ہوئے لوگ آدھار کی پوشیدہ معلومات حاصل کر کے پتہ لگایا جاسکیں کہ 'جس خاندان کی لڑکی یا لڑکا دیکھنے وہ جارہے ہیں اس خاندان کی ناک سلامت ہے بھی یا نہیں؟ ان دنوں ہمارے معاشرے میں لڑکیاں دیکھنے کی بجائے دعوتیں اڑانے کا چلن چل پڑا ہے۔ اور یہ سلسلہ دو، تین سالوں تک تو چلتا رہتا ہے۔ ہر کسی کو کرینہ اور کٹرینہ چاہیے، پھر بھلے ہی لڑکا ویلن کی طرح کیوں نہ دکھائی دیتا ہو؟ ...... اگر ان دنوں کسی کی ناک میں دم آیا ہوا ہے تو وہ لڑکی کے والدین ہیں۔

'ناک میں دم کرنا ...... اگر کوئی صاحب اس محاورے کی مزید تشریح کے خواہاں ہوں تو آپ کسی لڑکی کے والدین سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں ...... پچھلے دنوں حکومت نے بھی عوام کا 'ناک میں' کر رکھا تھا۔ آفت ناگہانی کی مانند اچانک نوٹ بندی کا اعلان کر دیا گیا۔ برسوں کی شناسائی پل بھر میں ختم ہوگئی۔ پانچ سو، اور ہزار کے نوٹ (کرنسی) جس سے لوگ باگ دل جاناں کی طرح لپٹے ہوئے تھے، ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوگئے! محبت کی جگہ نفرت نے لے لی۔ ایسی بیگانگی کہ لوگوں نے اپنی ہی کرنسی کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ پانچ سو اور ہزار کے نوٹ جنہیں برسوں سے گھر میں چھپا کر رکھا گیا تھا، راتوں رات ندی اور نالوں کے حوالے کر دیے گئے۔ حکومت نے ایک ایسے ولن کا کردار ادا کیا جو دو چاہنے والوں کو اپنے کرتوت سے جدا کر دیتا ہے۔ 'عوام بھی اپنا' ناک میں دم لیے لمبی لمبی قطاروں میں بٹ گئی۔ ان قطاروں میں بعض لوگوں کا دم بھی نکل گیا۔ لیکن حکومت اپنی پیٹھ خود آپ تھپ تھپاتی رہی، کہ اس نے وہ کام انجام دیا جو کئی دہائیوں میں کسی حکومت کو نہیں سوجھا۔ اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی کے مصداق یہ انہونی ہوئی اور عوام کے لیے وبال جان بن گئی۔ ہاسپٹلوں میں فقدانِ کرنسی نے کئی بیماروں کی سانسیں اکھاڑ دیں۔ بیماروں کے عزیز و اقارب کرنسی حاصل کرنے کے لیے دربدر بھٹکتے رہے۔ لیکن کچھ نہ ملا۔ بھلا ایک بھوکا دوسرے بھوکے کو کیا دے گا؟ عام آدمی کی محنت سے جمع کی گئی پونجی ایک لمحے میں ردی کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئی۔ ان کاغذ کے ٹکڑوں کو پھر سے کرنسی میں بدلنے کے لیے بے چاری عوام کو بینکوں کی چوکھٹ پر 'ناک رگڑنا' پڑا۔ بینک ملازمین نے بھی بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھوئے۔ کہیں کہیں بینک ملازمین اور غصیلی عوام کے درمیان تو تو میں میں بھی ہوئی۔ اس دوران جو شادیاں اس نوٹ بندی کی زد میں آئیں بغیر شہنائی اور بغیر تام جھام کے انجام دی گئیں ایسی شادی کرنے والوں اور کروانے والوں کے ارمان آنسوؤں میں بہہ گئے! جو فضول خرچی شادیوں کا طرہ بنی ہوئی ہیں اس پر نوٹ بندی نے نکیل کس دی۔ وقت گذر گیا یادیں چھوڑ گیا۔

ایسے قسمت کے مارے لوگ آج ان دنوں کو یاد کر کے سوچتے ہوں گے۔ 'کیا منحوس گھڑی تھی کہ 'بہار آنے سے پہلے خزاں چلی آئی!!۔۔

☆......O......☆

Umar Haneef
C/o Ruley STD, PCO
Jalalpura, Khamgaon - 444303 (M.S)

پرچہ ڈاک سے وصول نہ ہو تو پوسٹ کارڈ پر اطلاع دیجیے۔ اسٹاک میں موجود ہو تو دوبارہ ارسال کیا جائے گا۔ (ادارہ)

ڈاکٹر عائشہ فرحین
گلبرگہ

اُف یہ گرمی۔۔۔!

انسان ہمیشہ سے قدرت کے بدلتے تیور سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کرتا ہے،اوراسی کوشش میں اس کی صبح وشام ہوتی ہے ،زندگی تمام ہوتی ہے۔انسان بھی بڑا بے صبرا اور اضطرابی کیفیت کا مالک ہے،اسے نہ زیادہ بارش برداشت ہوتی ہے نہ خزاں کا حد سے زیادہ روکھا سوکھا منظرراس آتا ہے ۔ وہ، موسم سرما کی سردی سہہ سکتا ہے، نہ موسم گرما کی گرمی، بارش زیادہ ہوجائے تو اُف یہ بارش، سردی زیادہ ہوجائے تو اُف یہ سردی، گرمی زیادہ ہوجائے تو پھراُف یہ گرمی کا ورد کرتا نہیں تھکتا، حالانکہ وردتو خدا کی خدائی اورعظمت کا ہی کرنا چاہیے۔۔

انسان اتنا غیر مستقل مزاج ہے کہ اسے کسی حال میں بھی چین وقرار نہیں ،ہر حال میں وہ اپنے شکوے شکایتوں کا دفتر کھولے بیٹھتا ہے۔ہ

سردی زیادہ ہوتو شکوہ ،بارش کی کثرت ہوتو نالاں ،گرمی کا پارہ بڑھ جائے تو پھراس کا اپنا پارہ ساتویں آسمان تک پہنچ جاتا ہے۔ موسم کے بدلتے رتوں سے وہ کبھی خوشی تو کبھی غم مناتا ہے۔ہر چیز اعتدال کے ساتھ ہوتو سودمند، ورنہ نقصان دہ ہوتی ہے۔آج کل ہم اور آپ موسم گرما کی زیادتی کے شکار ہیں، جسے دیکھئے گرمی کی شدید لپیٹ میں پریشان حال ہے۔

ایسے میں ہمارے شہرگل و برگ کی تو بات ہی منفرد ہے، بے شک ہماراشہر ’’گل و برگ‘‘ سے بنا ’’گلبرگہ‘‘۔لیکن کوئی موسم گرما میں تلاش ’’گل و برگ‘‘ کی سعی مسلسل بھی کرے گا تو منھ کی کھائے گا۔ یہاں کی گرمی کہ کیا کہنے!یہ کبھی ۴۴ تو کبھی ۴۷ ڈگری سیلسیس تک پہنچ کرعوام کے ذہنوں پر یوں سوار ہے کہ نیند میں بھی ’’اُف یہ گرمی! کی صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔

اس گرمی نے کئی گھروں میں خوشیاں بانٹیں تو کئی گھروں سے ان کا سائباں بھی چھینا ہے۔اسی گرم لو کی بدولت کسی کے گھر اے سی، کسی کے پاس فریج تو کہیں پنکھا، کہیں مٹکہ کی آمد ہوئی اور اسی تپش کی وجہ سے کئی بزرگ خواتین وحضرات ہمیشہ کے لیے اس دارفانی سے کوچ کرگئے۔اب سورج جی کی اس بے رحمی کا گلہ ہم کس سے کریں،اس کے نہ کان ہے نہ کان پر جوں، جو وہ ہماری باتوں کا اثر لے ۔کوئی جیے یا مرے وہ تو اپنے محور پر گردش کرتا رہتا ہے،اوران شا اللہ تا قیامت گردش کرتا رہے گا۔اس کی اس شان بان کے آگے ہم اور آپ منھ کھولنا تو دور، آنکھ بھر کر دیکھنے سے بھی معذور ہیں۔

محکمہ موسمیات بھی سورج کے ہر پل بدلتے مزاج سے بے خبر رہتا ہے۔اِدھر انھوں نے یہ قیاس لگایا کہ آج سورج جی سب پر مہربان ہونگے اُدھر موصوف کا مزاج ایسا بگڑا کہ سب اُف یہ گرمی ،اف یہ گرمی کہتے رہ گئے۔کبھی جو یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ سورج جی کا مزاج بہت زیادہ بگڑے گا ،اُس وقت سورج جی نے ایسے ٹھنڈے مزاج کا مظاہرہ کیا کہ نہ صرف ہلکی ہلکی بوندا باندی ہوی بلکہ ،موسم بھی خوشگوار اور دلفریب ہوگیا۔گویا موصوف نے ٹھان لی ہو کہ موسم وبھاگ کی ہر پیشن گوئی کو غلط ثابت کریں گے۔

ایسے ہر پل بدلتے مزاج والے ’’سورج جی‘‘ کوان کی بے رحمی کا احساس دلانا گویا شہد کے چھتہ میں ہاتھ ڈالنا ہے۔بقول شاعر

اف یہ گرمی ہائے گرمی کیسی یہ گرمی آئی ہے
شدت گرمی سے دیکھو خلق کل گھبرائی ہے

خیر ہم تو خود ان کے بگڑے تیور کے شکار ہیں، ایک ہاتھ سے پسینہ پوچھتے دوسرے ہاتھ سے تعارف پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔موسم سرما میں تو سورج کی آمد کے سبھی منتظر نظر آتے ہیں اور موسم گرما ہو تو ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ بس آج آمد میں شدت نہ ہو۔مختلف پیشوں سے وابستہ خواتین وحضرات روزی روٹی کے چکر میں تو طلبا پڑھائی کے سلسلے میں گھر سے نکلنے پر مجبور ہیں، اب چاہے آندھی آئے طوفان یا گرمی کی شدید لو ہو انھیں تو اپنی ذمہ داریاں نبھانی ہیں۔

آج کل گھر سے باہر قدم رکھنے سے پہلے سورج جی کے مزاج کا پتہ کرنا ضروری ہے۔اگر موصوف کے تیور بگڑے ہوئے ہوں تو پھر سیر وتفریح کیا، شاپنگ کو بھی ملتوی کرنا پڑتا ہے۔لیکن مجبوری کسی نہ کسی وجہہ سے انسان کو گھر سے باہر نکلوا ہی دیتی ہے۔اب جب گھر سے باہر قدم رکھنا ہی ہے تو پھر گرمی سے بچنے کے سارے نام نہاد طریقے بھی اپنائے جاتے ہیں جیسے کوئی ٹوپی تو، کوئی چشمہ کوئی چھتری تو کوئی دوپٹہ اور کوئی آرام دہ اے سی کار میں خود کو مقید کرتا ہے۔

ایسے میں آپ بازار کا رخ کیجئے، وہاں بھی آپ کو ایک جم غفیر نظر آئے گا۔آوازوں کا شور ایسا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، ایسے میں بھاؤ تول، سے گاہک اور دکاندار دونوں کے مزاج گرم ہوجاتے ہیں۔ایک تو سورج کی گرمی پھر انسان کے اندر کی گرمی دونوں مل کر وہ رنگ جماتے ہیں کہ کہیں بات صرف تو تو میں تک تو کہیں ہاتھا پائی تک پہنچ جاتی ہے۔

ایسی ہی گرمی میں جب ہمارے گھر ہماری عزیز دوست شاہانہ کی آمد ہوئی تو ہم نے اس گرمی کا ذکر کیا، چونکہ ان کے پاس ہمارے ہر مسئلہ کا ایک نیا حل ہوتا ہے، ہماری پریشانی سن کر موصوفہ اپنے شاہانہ انداز میں یوں گویا ہوئیں، ارے آپ تو بے کار پریشان ہیں، میرے پاس اس گرمی سے بچنے کے خوب حل ہیں۔ آپ بازار میں ہوں اور شدید گرمی محسوس کر رہے ہیں تو ،سیدھے کسی ایئر کنڈیشنڈ شاپنگ مال میں چلے جائیں۔ بھلے ہی آپ کو کوئی شاپنگ کرنی نہ ہو،لیکن یہاں ہر دکان میں جائیں اور تھوڑی تھوڑی دیر تک مختلف چیزوں کو دیکھتے رہیں کہ بس انتظامیہ کو یہ شک نہ ہو کہ آپ خریداری کرنے نہیں بلکہ گرمی دور کرنے آئے ہیں۔دکانوں کے چکر سے تھک جائیں تو برقی سیڑھیوں سے کئی بار چڑھتے اترتے رہیے، گرمی دور ہوجائے گی۔آج کل جگہ جگہ ائیر کنڈیشنڈ اے ٹی ایم موجود ہیں، بس اس طریقہ کے لیے آپ کے پاس ایک عدد اے ٹی ایم کارڈ یا اس جیسے کوئی دوسرے کارڈ کا ہونا لازمی ہے، پھر آپ آرام سے کسی بھی اے ٹی ایم میں پیسہ نکالنے کے بہانے دیر تک گرمی سے بچ سکتے ہیں، اگر باہر کھڑے افراد آپ کے اس طرح دیر تک اندر رہنے پر شبہ ظاہر کریں تو انھیں بتادیں کہ اے ٹی ایم مشین میں کچھ خرابی ہے، پھر وہ باہر سے ہی آپ کی اس اہم معلومات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نو دو گیارہ ہوجائیں گے۔اس کے بعد آپ اپنا شغل یوں ہی دیر تک جاری رکھ سکتے ہیں۔ایک اور طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر آپ گھر میں موجود ہوں اور گرمی محسوس کر رہے ہوں تو سیدھے فریج کے سامنے جاکر اس کے دروازے کو کھلا چھوڑ دیں۔بس گرمی دور ہوجائے گی آپ کی اس حرکت کو گھر والے نہ دیکھ لیں ورنہ پانی ٹھنڈا نہ ہونے پر اُن کی گرمی کا بخار آپ پر ہی اترے گا۔اس کے علاوہ بھی ایک آزمودہ طریقہ یہ ہے جو فی الحال ہم کر رہے ہیں یعنی کسی کے بھی گھر مہمان بن کر چلے جائیں وہ خود چاہے بجلی بچانے کے غرض سے پنکھا بند کیے، گرمی میں تپ رہے ہوں لیکن آپ کے لیے اے سی آن کر دینگے کہ بھائی مہمان تو پھر مہمان ہی ہوتا ہے، ساتھ ہی ٹھنڈے مشروبات سے آپ کی گرمی کی شدت کو کم کردیں گے، جیسا کہ آپ نے ابھی مجھ ناچیز کے ساتھ کیا ،خیر اب مجھے اب اجازت دیجئے، باقی طریقے اگلی نشست پر اللہ حافظ۔ہم اپنی دوست کے بتائے طریقوں پر ابھی غور ہی کر رہے تھے کہ ہمارے ایک اور دوست کی آمد نے ہماری سوچوں کو بریک لگا دیا۔

اس گرمی میں انسان تو انساں جانور بھی پریشان ہیں اور اس

سے بچنے کے نئے نئے طریقے اپنا رہے ہیں، انھیں جہاں کہیں کوئی پانی کا گڑھا یا نل نظر آ جائے، اسی میں لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ اگر اس کا خاطر خواہ اثر نہ ہو تو پھر گرمی ان کے دماغ تک پہنچ جاتی ہے، ان کا سر ایسے پھر جاتا ہے کہ یہ کسی بھی انسان حتیٰ کے بچوں پر بھی غصہ نکالنے سے پیچھے نہیں ہٹتے۔

خیر سب کی اپنی اپنی مجبوری ہوتی ہے کہ اس کڑی دھوپ میں بھی بازاروں کی تفریح کرنے نکل پڑتے ہیں۔ کوئی بیوپاری ہے تو کوئی خریدار کسی کو اپنے گھر کا چولہا جلانا ہے تو کسی کا چولہا اسی بازار کی بدولت روشن ہے۔

موسم گرما کا ذکر ہو اور ٹھنڈے مشروبات اور آموں کا ذکر نہ ہو ایسا تو ممکن نہیں، بازاروں فٹ پاتوں پر جگہ جگہ بنے آم اور ٹھنڈے مشروبات کی یہ دکانیں گرمی کے شکار انسانوں کے لیے تقویت کا باعث ہیں تو وہیں کئی بے روزگار افراد کی روزی کا ذریعہ بھی۔ اب اگر انسان گرمی کے ڈر سے باہر ہی نہ نکلے تو پھر ان کی روزی روٹی کا انتظام کون کرے۔

موسم گرما ہو اور آم نہ کھائیں یہ تو ممکن نہیں، آج انسان نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ کئی نئے کمپنیوں نے نئی نئی تکنیک سے آم کے مشروبات بنائے ہیں، جس سے وہ سال بھر آم کا مزے لے سکتے ہیں، پھر بھی حقیقی مزہ تو آم کو آم کی طرح کھانے میں ہی ہوتا ہے۔ غالبؔ یوں ہی آموں پر فدا نہیں تھے، اپنے اشعار میں آموں کو کچھ اس طرح سے خراج پیش کیا ہے۔

باغبانوں نے باغ جنت سے
انگبیں کے بہ حکم رب الناس
بھر کے بھیجے ہیں سر بہ مہر گلاس

موجودہ دور میں انسان تو انسان آم بھی مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ امیر ترین لوگوں کے لیے جہاں آم بہت ہی خوش نما پیکٹوں میں پیک ہو کر مہنگے ترین شاپنگ مال کی زینت بن کر اپنا اسٹانڈرڈ بڑھاتے ہیں، وہیں فٹ پات اور ٹھیلوں میں مختلف سائز اور اقسام میں بٹے آم اپنے عام ہونے کا مظاہرہ کرتے ہیں، یہ آم، عام و خاص لوگوں کے لیے قدرت کا بیش قیمت تحفہ ہوتے ہیں۔ مہنگے شاپنگ مال میں سجے آم ہوں یا کسی اسٹال پر پڑے آم دونوں اللہ ہی کی تخلیق اور نعمت ہیں، جسے انسانوں نے اپنے اسٹیٹس کی نام پر بانٹ دیا۔ قانون قدرت سب کے لیے یکساں ہے چاہے وہ اے سی کی سرد ہوا پانے والے آفیسر ہوں یا کسی جھونپڑے میں گرم لو کے تھپیڑے کھانے والے مزدور، ہر ایک پر گرمی اپنا ایسا جادو چلاتی ہے کہ سبھی کہہ اٹھتے ہیں کہ اُف یہ گرمی!

اگر موسم گرما کی چھٹیاں ہوں، تو بچے خوش لیکن وہیں اس آفتِ کے ساتھ امتحانات کی آمد ہو تو پھر خدا ہی خیر کرے۔ موسم گرما کے ساتھ ہی بجلی کی کٹوتی، پانی کی قلت کا مسئلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔ بجلی کی قلت، پانی کی قلت، ایسے میں امتحانات سر پر ہوں تو نہلے پہ دہلا۔ طلبہ اُف یہ گرمی کہتے نہیں تھکتے۔ اب وہ پڑھیں بھی تو کیسے، گرمی ایسی کہ ہاتھ پسینہ پوچھنے میں، دماغ اپنی گرمی کو کنٹرول کرنے میں مصروف، دل تو کتابیں دیکھتے ہی بد دل ہو جاتا ہے، آنکھیں ان سب سے پریشان ہو کر نیند کی آغوش میں پناہ لینے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن گرمی کی وہ شدت ہے کہ نہ چین سے بیٹھنے دیتی ہے نہ سونے، کھانے، ہاں البتہ پینے پر کوئی پابندی عائد نہیں۔ ایسے میں بے چارے بچے پڑھیں تو کیسے پڑھیں، اس لیے ان کی ناکامی کا سہرا بچوں یا اسکول کے اساتذہ کے سر باندھنے کے بجائے اسی گرمی کے سر باندھنا چاہئے۔

خیر گرمی کے کرشمے بے حساب ہیں یہ کسی کو گھر سے باہر تو کسی کو گھر میں مقید کر دیتی ہے، کسی کو باپردہ تو کسی کو بے پردہ بھی کر دیتی ہے۔ آپ گرما میں اپنے آس پاس نظر تو دوڑائیں، ہر طرف آپ کو باپردہ خواتین، کے ساتھ باپردہ مرد حضرات بھی نظر آئیں گے، جو اپنے جسم کے ساتھ چہرہ کو بھی یوں چھپاتے ہیں جیسے پردہ ان ہی پر فرض ہوا ہو اور وہ اس کی پابندی کرنے میں سر فہرست ہوں، حالانکہ ان میں بیشتر وہ دوشیزائیں ہوتی ہیں، جنھیں دیگر ایام میں حجاب سے الرجی اور نقاب سے سانسیں رک جانے

کا خدشہ ہوتا ہے۔لیکن موسم گرما میں اپنی نازک جلد کی فکر انھیں باپردہ بنا دیتی ہے جو ان کے بے پردہ سوچ پر بھی پردہ ڈال دیتی ہے۔

موسم گرما کی آڑ میں کئی لڑکیاں بے پردہ بھی ہوجاتی ہیں۔ موجودہ دور میں جدید فیشن کی بدولت لڑکیاں جدید تراش خراش کے چست اور چھوٹے لباس پہننے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کر رہی ہیں، موسم گرما میں تو ہر کسی کو اس فیشن کو اپنانے کا سنہرا موقع مل جاتا ہے کہ بھائی گرمی جو ہے۔ بازاروں، اسکولوں اور کالجوں میں جہاں بھی جایئے ،لڑکیوں کا ایک ایسا بھی جم غفیر ہے جو موسم گرما کے بہانے اپنے جسم کی نمائش کرنے میں ہمہ تن مصروف ہے۔ والدین یہ کہہ کر کہ ابھی تو چھوٹی ہے، جوان ہو تو یہ سوچ کر کہ کہیں لڑکی اپنی ساتھیوں کے ساتھ فیشن کے دوڑ میں پیچھے نہ رہ جائے، یا یہ کہ گرمی بھی تو ایسی ہے، مختلف بہانوں کے ساتھ اپنی آنکھوں پر محبت کی پٹی باندھ لیتے ہیں، درصل اپنی بچیوں کے لیے آخرت کی دہکتی ہوئی آگ کا انتظام کر دیتے ہیں۔ پھر کیا موسم گرما، کیا موسم سرما، یہ بے حیائی پورے سال، رفتہ رفتہ پوری زندگی پر اس طرح حاوی ہوجاتی ہے جس سے چھٹکارہ پانا ناممکن ہوجاتا ہے۔

موسم گرما میں شادیوں کا بھی اپنا ایک الگ مزہ ہوتا ہے۔ آپ تھوڑا تصور تو کریں کہ سارا گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے، سب گرمی سے حیران، پریشان ہر دوسرے پل کسی نہ کسی کو ٹھنڈا پانی چاہیے، ایک کی فرمائش پوری کیجئے، دوسرا حاضر، دوسرے کی پوری کیجئے، تیسرا، تیسرے سے چوتھا، یہ سلسلہ یوں ہی دراز ہوتا جائے گا۔ ایسے میں بجلی کی کٹوتی، ہر طرف سے مختلف صدائیں بلند ہوں گی کہ بھائی پنکھا تو چلائیں، کوئی اے سی تو آن کر دے کوئی آئس کریم ہی منگوا دے، آپ لاکھ سمجھائیں کہ بجلی چلی گئی ہے، لیکن آپ کی سنتا کون ہے۔ اب چاہے یہ بجلی والوں کی غلطی کیوں نہ ہو۔ چاہے آپ نے اپنے بلس کلیر کر دیئے ہوں، چاہے انوٹر لگوا لیا ہو، لیکن گھنٹوں کے حساب سے برقی کٹوتی کا نظم، آپ کے ہر انتظام پر پانی پھیر دے گا۔ کسی گھر میں شادی ہو اور بچے نہ ہوں یہ بھی ممکن نہیں، یوں تو بچے اپنے کھیل کی دنیا میں مگن ہوتے ہیں، لیکن ایک مخصوص گھنٹی، ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالیتی ہے۔ یہ گھنٹی والا بھی بڑا چالاک ہوتا ہے جدھر بچے دکھائی دیے اس کے قدم وہیں جم جاتے ہیں اور گھنٹی کی آواز تیز ہوتی جاتی ہے، تاوقتیکہ بچے اپنے بڑوں سے رو دھو کر، گھر سر پر اٹھا کر والدین کی جیب ہلکی نہ کر دیں۔ اب وہ دور گیا جس میں ہم اور آپ روپیہ، دو روپے میں برف کے رنگ برنگے گولے کھا کر خوش ہوجاتے تھے، اب تو بچوں کو ۲۰، ۳۵، ۴۰، ۵۰، والی کوئن آئس کریم ہی چاہئے، فی بچہ کم سے کم ۲۰ روپئے روز تیار رکھیئے۔ وہ بھی اپنے گھر کے بچوں کی گنتی کے حساب سے، ادھر گھنٹی کی آواز، اُدھر بچوں کی پکار، کچن سے خاتون خانہ کی گرمی میں ڈوبی للکار، سب کا ایک ہی پرچار کہ اف یہ گرمی! اُف یہ گرمی!۔۔

ڈاکٹر عائشہ فرحین بنت محمد فاروق حسین
مصباح نگر، گلبرگہ
<farheen1336@gmail.com>

☆......○......☆

شگوفہ کا ایک یادگار و منفرد

یوسف ناظم نمبر

☆ یوسف ناظم کے ۵۰ سے زائد انشائیوں، خاکوں، سفرنامے، تنقیدی مضامین اور نظموں کا انتخاب ☆ یوسف ناظم کے فن کا جائزہ ☆ نامور نقادوں کے ۱۶ مضامین اور مختلف تصاویر

صفحات: ۳۰۰ قیمت: ۱۵۰ روپے

(رسالہ رجسٹرڈ پوسٹ ارسال ہوگا)

لکشمی دیوی راج
حیدرآباد

بلائے ناگہانی

جی میں نے cell phone کو یہ نام دیا ہے ! اس سے موزوں اور کوئی نام ٹھیک نہیں لگا ۔ خیر چھوڑیے ۔ اس بلا کے نازل ہونے سے پہلے زندگی بڑی پرسکون گزر رہی تھی کوئی ہنگامہ برپا نہیں تھا ۔ ہاں کسی ایمرجنسی میں یہ شاید کارآمد شئے ہوسکتی ہے ۔لیکن لازمی تو نہیں کہ ہر وقت اس کو کان سے لگائے رکھا جائے ۔ دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ اس وقت بھی سل فون استعمال کرتے ہیں جب ان کے ہاں مہمان آئے ہوئے ہوں ۔ کم از کم اتنی تمیز ہونی چاہیے کہ فون کرنے والوں سے یہ کہہ کر معافی چاہ لیں کہ اس وقت ان کے ہاں مہمان ہیں یا پھر کہہ دیں کہ وہ مصروف ہیں ، بعد میں بات کرسکتے ہیں ۔ امریکہ ، انگلینڈ وغیرہ ممالک میں اس قسم کی نالایقی نظر نہیں آتی ۔

یہ رہی گھر کی بات اب آپ چلیے ، باہر چلیے ۔ سڑک پر ایک اور تماشہ دیکھیے ۔ آپ کے سامنے سے ایک شخص ٹو وہیلر پر جارہا ہے جس کے کان ، ناک اور منہ سے سفید تار لٹکے ہوئے ہیں اور وہ کان پر cp لگا کر گردن ٹیڑھی کر کے بڑے اطمینان سے چلا جارہا ہے ۔اس کو دنیا و مافیھا کی کوئی خبر نہیں ۔ اسے تو صرف بات کرنا ہے اور جواب سننا ہے ۔ بکواس میں اس قدر مصروف ہے کہ اس کو پتہ نہیں کہ اس کے پیچھے بھی کوئی قسمت کا مارا آرہا ہے ۔ یا تو وہ کسی کو دھکا دے گا اور فرار ہوجائے گا ۔ ایک اور ادا دیکھیے جو بہت ہی ماڈرن ہے ۔ کانوں میں تار لٹکائے موسیقی سنتے ہوئے اسکوٹر پر رواں دواں ہے ۔ اور مخصوص انداز میں لطف اندوز بھی ہورہا ہے ۔ ان کے پیچھے کار سوار اس کو اس نشے سے جگانے کے لیے ہارن بجا بجا کر دکھی ہورہا ہے ۔ اسکوٹر سوار بے فکر و بے نیاز ہلکے ہلکے تھرکتا آگے بڑھ رہا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ گھر سے نکل رہا تھا تو غالبا یہ کہہ کر نکلا ہوگا کہ ' اگر میں بہت دیر تک نہیں لوٹا تو سمجھ لیجیے میں اللہ کو پیارا ہوگیا ۔ دوسرے دن آپ کو اخبار سے اطلاع مل ہی جائے گی ' ۔ ویسے بھی آج کل اخبار میں اور چھپتا ہی کیا ہے ؟ یہی قتل ، جنسی ہراسانی کے واقعات ٹریفک حادثے وغیرہ ۔ مودی جی کے ' اچھے دن ' کے سپنوں کی سرخیاں بھی غائب ہوگئی ہیں ۔

یہ تو ہوا ٹو وہیلر کا حال اب ان کو دیکھیے جو پیدل سڑکوں پر چل رہے ہیں ۔ یا راستہ پار کررہے ہیں ۔ ایسے چلتے ہیں جیسے وہ اپنے گھر کے آنگن میں ہیں یا کسی باغ میں ٹہل رہے ہیں ۔ نہ دائیں دیکھتے ہیں نہ بائیں ، ہاتھ میں سل فون ہے اور وہ مسکراتے ہوئے سڑک پار کرنے میں مصروف ہیں ! ان کے پیچھے کار چلانے والے کا فرض ہے کہ وہ راہرو کی آزادی کو متاثر کیے بغیر دھیرے دھیرے اپنی کار آگے بڑھائیں ، ان حضرت کو دھکا نہ لگے ۔ یا تو وہ گاڑی دھیمی کر کے ہارن بجانا شروع کرے اور ان کو جگا دے ' بھیا مہربانی کرو آگے سے ہٹو اور مجھے چین سے چلا جانے دو ' ۔

سیل فون کی پیدائش کے پہلے یعنی کوئی پچاس یا ساٹھ سال قبل بڑے پرسکون دن گزر رہے تھے ۔ لوگ آپس میں اطمینان سے ملتے جلتے تھے ، بات چیت کرتے تھے ۔ ان دنوں بیماریاں بھی کچھ زیادہ پھیلی ہوئی نہیں تھیں اور لوگوں کو ایک دوسروں کی خیر خیریت پوچھنے کا وقت تھا ۔ کینسر جیسی موذی بیماری کم کم ہوا کرتی تھی ۔ آج کل یہ سمجھنا مشکل ہوگیا ہے کہ کینسر زیادہ موذی ہے یا ! سیل فون !!

ایسا لگتا ہے کہ جیسے آج کی نسل سیل فون ہاتھ میں لے کر ہی تولد ہوئی ہے ! خدا خیر کرے !! ۔ ۔

☆......○......☆

اقبال شاؔنہ
بودھن

تیز دھوپ ہے

چھتری ذرا نکال ، بڑی تیز دھوپ ہے
گرمی سے ہوں نڈھال ، بڑی تیز دھوپ ہے

سورج دہک رہا ہے مرے سر پہ جان من
بکھرا کے زلف ڈال ، بڑی تیز دھوپ ہے

سر پک رہا ہے دھوپ کی تیزی سے یار کا
چہرہ ہے لال لال ، بڑی تیز دھوپ ہے

مجھ کو ذرا بتا ہے خطِ استوا کہاں
جغرافیہ نکال ، بڑی تیز دھوپ ہے

گرمی سے میں کباب نہ بن جاؤں جانِ جاں
پانی میں مجھ کو ڈال ، بڑی تیز دھوپ ہے

شہتوت کا ذرا مجھے شربت پلا دے تو
ہوجاؤں میں بحال ، بڑی تیز دھوپ ہے

کشمیر کے ہیں سیب ، ٹماٹر یا دلی کے
ہیں سرخ سرخ گال ، بڑی تیز دھوپ ہے

گرما میں لگ رہا ہے مجھے ایسا گلستاں
لکڑی کی جیسے ٹال ، بڑی تیز دھوپ ہے

مصرع کو بھون بھون کے شاؔنہ سنا غزل
اشعار کو اُبال ، بڑی تیز دھوپ ہے

......☆......

گرمیوں کا موسم

دھوپ میں نہ مرجھاؤ ، گرمیوں کا موسم ہے
چھاؤں میں چلے آؤ ، گرمیوں کا موسم ہے

نرم نرم ہاتھوں سے ٹھنڈے پانی کا
اک گلاس لے آؤ ، گرمیوں کا موسم ہے

لگ رہا ہے یوں مجھ کو ، خطِ استوا پر ہوں
بحرِ منجمد لاؤ ، گرمیوں کا موسم ہے

ہوسکے اگر جاناں ، برف ہاتھ میں لے کر
خواب میں چلے آو ، گرمیوں کا موسم ہے

گر پڑوگے چکرا کر کوچۂ حسیناں میں
عاشقی نہ فرماؤ ، گرمیوں کا موسم ہے

گر زمین کی گرمی یار سہہ نہیں سکتے
چاند پر چلے جاؤ ، گرمیوں کا موسم ہے

دھوپ کی حرارت سے تو بہک گئے شاؔنہ
شاعری نہ فرماؤ ، گرمیوں کا موسم ہے

......☆......

سنیل کمار تنگ

شوخیِ گفتار

آپ یوں ہی گالیوں کو گالیاں مت دیجیے
باپ دادا کی وراثت کی حفاظت کیجیے
دھیرے دھیرے پیار کے احساس کا رس پیجیے
عشق کے یہ جام ہیں دو گھونٹ تو لے لیجیے

سوچیے تو گالیاں بھی شوخیِ گفتار ہیں
حاکموں کی شان ہے کمزور کے ہتھیار ہیں

گالیوں میں ہوتا ہے رشتوں کا میٹھا ذائقہ
گالیاں کھا کر چچا غالبؔ ہوئے کب بے مزہ
گالیوں سے مٹتا رہتا ہے دلوں کا فاصلہ
گالیوں میں ڈھونڈھیے اپنے پرائے کا پتہ

گالیاں دینی اگر ہوں دیجیے دل جان سے
شرط ہے لیکن گلے لگ جایئے پھر شان سے

گالیاں جو دے رہے ہیں وہ سلیقے دار ہوں
گالیوں کے فلڈ کے مانے ہوئے فن کار ہوں
گالیاں کھٹی اگر ہو میٹھی بھی دو چار ہوں
پھول ہوں اندر سے ، باہر سے بھلے تلوار ہوں

یہ سلیقہ ہے ضروری گالیوں کے واسطے
بھاگنا پڑ سکتا ہے ورنہ گلی کے راستے

گالیاں جب بھی سنیں بالکل تر و تازہ لگیں
کاروبارِ عشق کا جیسے یہ خمیازہ لگیں
کھر درے چہرے پہ اپنے حسن کا غازہ لگیں
یہ تعلق جوڑنے کا چور دروازہ لگیں

گالیاں سن کر مجھے ایسا لگا نعمت ملی
ورنہ اب تک پیار کر کے مستقل زحمت ملی

جب بھی امریکہ میں میں ملتا ہوں مسٹر جان سے
گالیاں دیتے ہیں وہ بھی خوب اطمینان سے
اس پہ طرہ دیکھیے کہتے ہیں کتنی شان سے
آئی ہیں امپوٹ ہو کر یہ تو ہندوستان سے

گالیوں کے فلڈ میں امریکہ تو کنگال ہے
آپ کی ان گالیوں کا دل سے استقبال ہے

جو ہمارے ملک میں جمہوریت کا ساز ہے
دیکھنے میں جو عوام الناس کی ہمراز ہے
اندھے گونگے بہرے سب کی رینگتی آواز ہے
اس سیاست کو بھی اپنی گالیوں پہ ناز ہے

اب تو سنسد میں ضروری ہے کہ ایسا میل ہو
جوتے چپل بند ہوں بس گالیوں کا کھیل ہو

اس طرح سے دشمنوں کا دل جلانا سیکھیے
گالیاں کھا کر بھی تھوڑا مسکرانا سیکھیے
گالیوں پر گالیاں کھانا کھلانا سیکھیے
آیئے ہم سے یہ ذوق عاشقانہ سیکھیے

گالیاں نا کھائیں گے تو دیکھتے رہ جائیں گے
اپنی غیرت کی ندی میں آپ خود بہہ جائیں گے

وہ زبان میرؔ میں دلی کی گالی ہائے ہائے
لکھنوی انداز کی نازک خیالی ہائے ہائے
اور عظیم آباد کے فکروں میں سائی ہائے ہائے
حیدرآبادی وہ ہر گالی مثالی ہائے ہائے

گالیوں میں ایک جہتی ملتی ہے اس دور میں
جیسی گالی ممبئی میں ویسی ہی لاہور میں

ایک اک جملے میں دس دس خبطیوں کا یہ کمال
بھوجپوری گالیوں سے ہے بہاری مالا مال
کولکاتا ، ممبئی ، مدراس سب کا ایک حال
اپنی اپنی گالیاں خود اپنی اپنی ہیں مثال

راجدھانی دلی کی آب و ہوا سے پوچھیے
گالیوں کا لطف استاد رساؔ سے پوچھیے

تنگؔ صاحب گالیوں کی عظمتوں کو جانیے
گالیاں سچائیوں کے آئینے ہیں مانیے
چھل کپٹ کی جانی دشمن ہیں انہیں پہچانیے
آپ بھی گالی بکیں گے اپنے دل میں ٹھانیے

محفلِ شعر و سخن میں شاعری مت کیجیے
جو محبت کو بڑھائے ایسی گالی دیجیے

غزلیں

نوید ظفر کیانی

غمِ ہستی میں لذت ہے؟ نہیں تو!
بہت جینے کی حاجت ہے؟ نہیں تو!

دئے سارے ہی بجھتے جا رہے ہیں
ہواؤں سے شکایت ہے؟ نہیں تو!

فضاؤں کی خموشی ہے معمہ
نئی رُت کی بشارت ہے؟ نہیں تو!

جو حرزِ جاں ہی بنتی جا رہی ہے
نہایت خوبصورت ہے؟ نہیں تو!

کہا جاتا ہے جس کو زندگانی
مسافت در مسافت ہے؟ نہیں تو!

اُسی کی طرح اُس سے روٹھ بیٹھوں
کچھ اس میں بھی قباحت ہے؟ نہیں تو!

جو آئینے میں میرے سامنے ہے
مری اُس سے شباہت ہے؟ نہیں تو!

میں کس مکڑی کا جالا بُن کے دیکھوں
اُسے میری ضرورت ہے؟ نہیں تو!

ابھی اپنا پتہ ملتا نہیں ہے
مری خود میں سکونت ہے؟ نہیں تو!

ظفؔر ترکِ وفا جب کر چکے ہو
اب اس کے بعد فرصت ہے؟ نہیں تو!

......☆......

یہاں رہتا نہیں ہے حسن میں حسنِ خطاب اکثر
فدائی کو ملا ٹھینگے کی صورت بھی جواب اکثر

یوں دن ناکام لیڈر گنتے رہتے ہیں حکومت کے
کمیٹی والی ماسی جیسے رکھتی ہے حساب اکثر

ہمارا دل چرانے والا ہی پردہ نشیں کب ہے
کہ ڈاکو بھی نظر آتے تو ہیں زیرِ نقاب اکثر

سدا ایسے فلاحی کام جان و دل سے کرتا ہے
صحافی کو ملے جس سے لفافے کا ثواب اکثر

بہت چاہے ہے جی اوروں کو کچی سے پکڑنے کا
مگر اچھا نہیں لگتا ہے اپنا احتساب اکثر

جو گھر والی کو ماں یاد آئے ہم کو نانی یاد آئے
ہمارا بخت بن جاتا ہے سسرالی عذاب اکثر

کبھی جو حسنِ کافر دعوتِ نظارہ دیتا ہے
بزرگوں کی بھی نظروں میں اُبلتا ہے شباب اکثر

ہمارے طالبانِ علم کی نالج کے کیا کہنے!
کراچی میں بہا دیتے ہیں دریائے چناب اکثر

مخالف پارٹی کے ساتھ مل کر خوار ہوتا ہے
خرد کی جب نہیں سنتا دلِ خانہ خراب اکثر

......☆......

سید عبید اللہ ہاشمی
ہاشمیہ کالونی، ہزاری باغ۔ ۸۲۵۳۰۱، موبائل 09934516155

موسم گرما کے روزے

حال ہے بے حال رمضاں میں جوان و پیر کا
"سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا"
حال کیا ہے صائموں کا ان دنوں مت پوچھیے
شام کرنا صبح کا لانا ہے جوئے شیر کا
پیاس کی شدت سے کچھ ایسے ہوئے ہیں مضمحل
"مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا"
موسمِ گرما میں روزے کی مشقت الاماں
معجزہ کہیے اسے ایمان کی تنویر کا
صبح سے تا شام رہنا آب و دانہ کے بغیر
کام ہے بے شک یہ اپنے نفس کی تسخیر کا
سوکھ کر کانٹا ہوئی حلقوم کے اندر زباں
جسم و جاں کے واسطے موقع ہے یہ تطہیر کا
وقت مغرب بے قراری کا ہے وہ عالم کہ بس
ہر بشر ہے منتظر آوازۂ تکبیر کا
سیب و انگور و انار و تربزہ، کیلا، کھجور
سامنے منظر ہے اِک فردوس کی تصویر کا
سارے دن کی سختیوں کے بعد حاصل یہ سرور
ہو نہیں سکتا بیاں افطار کی تاثیر کا
نیند کے مارو اٹھو ، کچھ نوشِ جاں سحری کرو
مسجدوں میں شور ہے اِک نالۂ شب گیر کا
پیٹ شربت اور پانی سے بھرا ہے، کھائیں کیا
وقت سحری اِک پیالہ چاہیے بس کھیر کا
ہاشمی افطار میں برفاب ہے مرغوب جاں
شربت روح افزا رکھتا ہے اثر اکسیر کا

غزل

ڈاکٹر ہادی منزہ

جائے گا قاتل ستم گر اب نہیں تو کل سہی
ختم ہوگا یہ دلندر اب نہیں تو کل سہی
باقی ہے چنگیز خاں کا نام نہ ہٹلر کا ہے
جائے گا یہ بھی سکندر اب نہیں تو کل سہی
سارے ہی حالات بدلیں گے یہاں پر دیکھیے
آئیں گے سارے ہی بہتر اب نہیں تو کل سہی
بد دعا مظلوم کی ہوگی کسی دن تو قبول
حکمراں ہوگا یہ در در اب نہیں تو کل سہی
ہے یقیں اس بات کا کہ جائے گا یہ حکمراں
بوریہ بستر لپٹ کر اب نہیں تو کل سہی
نفرتوں کی یہ سیاست ختم ہوگی ایک دن
پیار پھر پھیلے گا گھر گھر اب نہیں تو کل سہی
ذہنوں میں بارود بھرنے کا ہے جن کا کاروبار
بند ہوں گے سارے دفتر اب نہیں تو کل سہی
قتل معصوموں کا کرتے ہیں کسی بھی نام پر
جائیں گے جیلوں کے اندر اب نہیں تو کل سہی
بند ہیں معصوم جو جیلوں کے اندر ملک کی
آئیں گے عمت سے باہر اب نہیں تو کل سہی
مسخ جو بھی کررہے تاریخ سارے ملک کی
وہ ہی مٹ جائیں گے شاطر اب نہیں تو کل سہی
جو غلامی کی نشانی کہتے ہیں اس تاج کو
کھائیں گے وہ جوتے رخ پر اب نہیں تو کل سہی
مغلوں کی منصف مزاجی سے ہی ہیں وہ ملک میں
بات کو سمجھیں گے مل کر اب نہیں تو کل سہی
بس اسی امید پر تو سب منزہ جی رہے
بدلے گا خونی یہ منظر اب نہیں تو کل سہی

خودنوشت

منظور وقار
گلبرگہ
9731428416

جھوٹ بولے کوا کاٹے

ہم 5 ڈسمبر 1953ء کو گلبرگہ کی ایک پتلی گلی کے تنگ مکان میں پیدا ہوئے ۔ پیدا ہو کر کوئی کارنامہ انجام دے سکے اور نہ کشتی پہلوان بن کر پڑوسیوں پر دھاک بٹھا سکے ۔مختار مسعود نے اپنی کتاب آواز دوست میں لکھا ہے:

''دو قدم آگے بڑھ گئے تو فاتح عالم ، دو قدم پیچھے ہٹ گئے تو تنگِ کائنات ، درمیان میں رہ گئے تو ہجوم بے مصرف'' ہم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ دو قدم آگے بڑھ کر فاتح عالم کہلاتے اور نہ اتنی بزدلی تھی کہ دو قدم پیچھے ہٹ کر تنگِ کائنات کہلاتے چنانچہ درمیان میں رہ کر ہجوم بے مصرف میں مزید اضافہ کر دیا ۔والدین نے ہمارا نام منظور احمد رکھا تھا ہوش سنبھالنے کے بعد پتہ چلا ہم والدین کی نظروں میں تو منظور نظر ہیں لیکن سماج اور سوسائٹی کی نظروں میں منظور بے مصرف ۔ہمیں نام کا وقار بلند کرنا تھا منظور کے آگے وقار لگا دیا یوں منظور احمد سے منظور وقار بن گئے کچھ دن بعد احساس ہوا صرف نام کے آگے وقار لگانے سے وقار میں اضافہ تھوڑے ہی ہونے والا ہے اس کے لئے کوئی نہ کوئی اہم کارنامہ ضروری ہے لہٰذا ہاتھ پیر مار کر کسی طرح بی ۔اے پاس ہوئے ، پورے خاندان میں پہلی بار بی ۔اے کی ڈگری حاصل کرنے والے ہم واحد فرد تھے لہٰذا ہمارا دماغ آسمان میں اڑنے لگا ، خود کو کمشنر سمجھنے لگے ۔ چار پانچ برس تک بے روزگار رہنے کے بعد احساس ہوا ہم کمشنر ہیں اور نہ آفیس کلرک برخلاف اس کے بے روزگاری کا داروغہ بن کر سڑکوں کی خاک چھان رہے ہیں ۔ اس سے پہلے کہ بے روزگاری کا عذاب ہمارے وقار کو بخار میں مبتلا کر دیتا حکومت کرناٹک نے ہمیں محکمہ مالگزاری میں سرکاری ملازمت فراہم کر دی ۔ ہم بہ حیثیت ریونیو انسپکٹر دیہاتوں کی خاک چھاننے کے لئے بیجاپور ضلع کے دیہاتوں میں پہنچ گئے ۔ ملازمت کے بعد شادی ہوئی بچے ہوئے ، دیگر شادی شدہ مردوں کی طرح ہم بھی کولہو کا بیل بن کر رہ گئے ۔ محکمہ مالگزاری میں تیس برسوں تک ملازمت کے فرائض انجام دینے کے باوجود محکمہ مال کے مال کو لوٹا اور نہ اوپر کی آمدنی کو ہاتھ لگایا ۔ اس ایمانداری (دوستوں اور گھر والوں کی نظروں میں بے وقوفی) کا نتیجہ یہ نکلا کہ خالی ہاتھ محکمہ مال گزاری میں داخل ہوئے تھے ریٹائر ہو کر خالی ہاتھ مکان لوٹ آئے ۔ ہم ملازمت سے قبل کرایہ کے مکان میں تھے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی کرایہ کے مکان میں ہیں ۔ جہاں تک اردو ادب کے میدان میں قدم رنجہ فرمانے کا معاملہ ہے دور طالب علمی (میٹرک) ہی سی کرشن چندر ، منٹو ، بیدی ، خواجہ احمد عباس ، ابراہیم جلیس اور رام لال کے افسانے پڑھنے کا شوق تھا ۔ ابن صفی کی جاسوسی ناولوں میں تو ہم صبح شام ڈوبے رہتے تھے ۔ان قلمکاروں کے افسانے اور تصانیف کا مطالعہ کرتے کرتے ایک دن ہمیں احساس ہوا (دراصل نروان حاصل ہوا) کہ ہم خود بھی افسانے اور منی افسانے لکھ سکتے ہیں ۔ 1978ء میں پہلا مختصر افسانہ مقدس رشتے لکھ کر روزنامہ سالار (بنگلور) کو روانہ کر دیا تو افسانہ سالار ادبی ایڈیشن میں فوراً ہماری مسکراتی تصویر کے ساتھ شائع ہو گیا ۔ ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی ہمیں لگا ہم بھی کرشن چندر اور منٹو سے کم نہیں افسانے اور منی افسانے لکھتے گئے اخبارات اور رسائل کو روانہ کرتے گئے ۔ایک دن سٹی زن لائبریری گلبرگہ میں ماہنامہ شمع ، بانو بیسویں صدی ، خاتون مشرق ، ہما اور شبستان جیسے مقبول خاص و عام رسائل کی صف میں ماہنامہ شگوفے کو دیکھا تو حیرت سے شگوفہ کے ورق الٹنے لگے کیونکہ مندرجہ بالا ادبی رسائل تو ہمارے مطالعہ میں تھے لیکن شگوفہ اور اس کی مشمولات سے نابلد ۔ چنانچہ شگوفہ کو فوراً جھپٹ لیا اور لائبریری میں کھڑے کھڑے ہی نصف سے زیادہ مضامین پڑھ ڈالا ۔ ادھر ہم شگوفہ کے مضامین کا مطالعہ کر رہے تھے ادھر

ہمارے چہرے پر مسکراہٹ اور ہونٹوں پر قہقہے نازل ہورہے تھے۔ ہمیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی شگوفہ رونے رولانے والا رسالہ نہیں ہنسنے ہنسانے والا رسالہ ہے۔ ویسے بھی ہنسی مذاق طنزومزاح کے جراثیم ہمارے اندر منھ چھپائے بیٹھے ہوئے تھے۔ شگوفہ ہاتھ لگتے ہی جراثیم منھ اٹھا کر باہر نکل آئے۔ اس دن کے بعد شگوفہ ہماری کمزوری بن گیا۔ دل ہی دل میں خواہش جاگی کہ کیوں نہ ہم بھی طنزیہ ومزاحیہ مضمون لکھ کر مزاح نگاروں کی صف میں (آخری صف میں ہی سہی) شامل ہوجائیں۔ خوش قسمتی سے وہ سال 1981ء معذوروں کا سال تھا دنیا بھر میں معذوروں کی فلاح و بہبود کے ڈنکے بج رہے تھے۔ ان ڈنکوں کی آواز میں ہم اپنا ڈنکا بجانے کے لئے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک مضمون (انشائیہ) لکھ ڈالا عنوان رکھا ''معذوروں کا سال''۔ مضمون اشاعت کے لئے شگوفہ کو روانہ کردیا شگوفہ کے مدیر اعلیٰ محترم مصطفےٰ کمال کو معذوروں سے ہمدردی تھی یا ہماری حوصلہ افزائی مقصود، انہوں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً مضمون کو اگست 1981ء کے شمارے میں شائع کردیا! ''معذوروں کا سال''، کو شگوفہ میں دیکھا تو ہمارے اندر برسوں سے اوندھے منھ پڑے ہوئے چودہ طبق اچانک روشن ہوگئے۔ پھر کیا تھا ہم انشائیے طنزیہ ومزاحیہ مضامین رپورتاژ اور خاکے لکھتے گئے مصطفےٰ کمال صاحب شگوفہ میں جگہ دیتے رہے۔ صرف پانچ سال میں پندرہ بیس مضامین شگوفہ کی زینت بن گئے تو ہمارا دماغ آسمان میں اڑنے لگا ۔ پطرس بخاری، مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین ہمارے لنگوٹی یار نظر آنے لگے اس پر سونے پہ سہاگا یہ کہ ہمارے ادبی و نیم ادبی دوستوں نے ہمارے بگڑے دماغ کو مزید بگاڑنے کے لئے مشورہ دیا کہ ہمارا شمار مزاح نگاروں میں ہونے لگا ہے اب ہمیں صاحب کتاب بن جانا بے حد ضروری ہے۔ ہم نے دوستوں کے مشورے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کتاب کا مسودہ تیار کیا اور کتاب کا نام رکھا ''ہنسنا منع ہے''۔ کتاب شائع کرنے کیلئے درکار رقم سے جیب خالی تھا لہٰذا مالی اعانت کے لئے مسودہ کرناٹک اردو اکاڈمی (بنگلور) کو روانہ کردیا۔ شاید اکاڈمی کے عہدیداران کو بھی خراب کتابیں شائع کرنے کی جلدی تھی انہوں نے فوراً ''ہنسنا منع ہے'' کی اشاعت کے لئے مالی اعانت منظور کردی۔

یوں ہمارے انشائیوں کی پہلی کتاب اڑی اڑی کتابت لتھو پریس کی کالی پیلی طباعت کے ساتھ 1990ء میں شائع ہوگئی۔

ہمارے چالیس سالہ ادبی سفر میں ہم نے طنزومزاح کے علاوہ افسانے بھی لکھے افسانچے بھی خاکے بھی لکھے تبصرے بھی لیکن افسانچے ہوں کہ خاکے تبصرے ہوں کہ رپورتاژ ہماری ہر طرح کی تحریر میں طنزومزاح کا رنگ ضرور دیکھنے کو ملتا ہے کیونکہ بنیادی طور پر ہم مریض طنزومزاح ہیں۔

اب تک دو کتابیں کرناٹک اردو اکاڈمی کے زیر اہتمام شائع ہوچکی ہیں ہنسنا منع ہے 1990 کانٹوں کا جھنڈ 2015 طنزومزاحیہ مضامین پر مشتمل دو تصانیف ''مسکرانا منع ہے''، ''پڑھنا منع ہے'' بہت جلد منظر عام پر آنے والی ہیں علاوہ ازیں خاکوں کے تین مجموعے تبصروں اور رپورتاژ کی ایک ایک کتاب زیر ترتیب ہے۔ اب تک ہم نے اتنی بڑی تعداد میں انشائیے خاکے افسانے افسانچے تبصرے اور رپورتاژ لکھے ہیں کہ اس کا بھی صحیح اندازہ نہیں ہاں ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہماری نثری تخلیقات کی تعداد ہزاروں میں ہے۔

ہم صرف نثر لکھتے ہیں شاعری کو ہاتھ نہیں لگاتے کیونکہ ہمیں پتہ ہے ہمارے ہاتھوں نثر نگاری کا جو حال ہوا سو ہوا شاعری تو کم از کم ہمارے قلم کی زد سے محفوظ رہے۔

ملک کے مختلف شہروں میں منعقدہ کل ہند ادبی اجلاسوں میں تخلیقات سنانے کا موقع ملا ہے۔ مختلف اردو انجمنوں اور تنظیموں نے چھوٹے موٹے ایوارڈ اور انعامات سے بھی نوازا ہے۔ ہمارے بزرگ دوست علامہ کاروباری کا کہنا ہے کہ بڑے ایوارڈوں کے پیچھے بڑے آدمیوں (سیاسی قائدین) کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ہم بڑے آدمیوں (سیاسی قائدین) سے بارہ کوس دور رہتے ہیں، ظاہر ہے کوئی بڑا آدمی ہمیں کیوں گھاس ڈالے گا۔ ویسے بھی ہمیں ایوارڈ اور اعزازات حاصل کرنے کا اتنا شوق نہیں جتنا لکھنے پڑھنے کا جنون ہے۔ یہی جنون ہماری دماغی آسودگی کا باعث ہے۔!!! ☆

ڈاکٹر غضنفر اقبال
9945015964

فنافی الادب: منظور وقار

شام کے سائے گہرے ہونے لگے ۔سفر معکوس ہے ۔ماہ نامہ ایوانِ اُردو ستمبر 1987ء کی ورق گردانی کرتے ہوئے افسانہ ''گھبرائے ہوئے لوگ'' پر میری نگاہیں ٹھہر گئیں ۔افسانہ منظور وقار کا تھا ۔ان دنوں میرا قیام مراٹھواڑا کے شہر بیڑ میں تھا ۔میں شہر بندہ نوازؒ اور فیروز شاہ بہمنی کی سرزمین گلبرگہ کے فن کاروں سے واقف تھا لیکن منظور وقار کا نام میرے لئے نیا تھا۔افسانہ پڑھا افسانہ ذہن میں تو نہ رہا۔البتہ افسانہ نگار کا نام ذہن میں محفوظ رہ گیا۔وقت کے چاک پر سال گردش کرتے رہے۔میں بیڑ کی مشہور تعلیم گاہ ملیہ میں بی اے سال سوم کا طالب علم تھا۔کالج کی سالانہ تقاریب کے موقع پر ایک مزاحیہ مشاعرے کا انعقاد بی اے سال سوم کے طالب علموں کی جانب سے ہوا تھا۔میری ذاتی لائبریری میں ایک کتاب ہاتھ لگی '' ہنسنا منع ہے'' مصنف منظور وقار ۔ میں نے کتاب پڑھی کتاب سے ہی مزاحیہ مشاعرے کی مناسبت سے شاعروں کے نام امیر علی مایوس، مجبور احمد مفلس ،امیر احمد اونچا، امجد ہتھوڑا، کمزور احمد طاقت اٹھائے گئے۔اور اپنے ہم جماعت ساتھیوں کے نام رکھ دئے گئے ۔کلام عظمت بھلاواں کے شعری مجموعے 'بھلاویں کے داغ' سے ماخوذ تھا۔

1999ء میں وطن مالوف گلبرگہ منتقل ہونے کے بعد روز نامہ سالار دکن گلبرگہ میں ادبی صفحہ 'القلم' ترتیب دیا کرتا تھا۔سالارِ دکن کے دفتر میں ایک دن عزیز اللہ سرمست نے کہا تھا کہ میرے ایک قریبی دوست بیجاپور کے تعلقے تالی کوٹ میں بہ سلسلہ ملازمت برسرکار ہیں ، نام ہے منظور وقار ۔ ان کا ایک مضمون ''فقرا کی انجمن'' ہے اس مضمون کو القلم میں شائع کیا جائے ۔عزیز اللہ سرمست کی خواہش پر میں نے وہ مضمون شائع کیا تھا۔منظور وقار کا ذکر جمیل اکثر امجد علی فیض مرحوم کیا کرتے تھے۔وقت گذرتا رہا۔ پھر ایک دن منظور وقار سے ملاقات ہوئی ۔موصوف سے پہلی ملاقات کا خوشگوار تاثر ذہن وقلب پر رہا۔ایک ڈوبتی شام تھی ڈاکٹر انیس صدیقی نے کہا کہ منظور وقار نے آپ پر خاکہ لکھ کر تالی کوٹ سے ارسال کیا ہے ۔خاکے کا عنوان تھا۔آدمی غضب کا: غضنفر اقبال 'منظور وقار کی تحریر اس قدر غضب کی تھی کہ میں حیران رہ گیا کہ موصوف سے میری ایک رسمی سی ملاقات اور اس قدر جامع تحریر راقم التحریر پر لکھی گئی منظور وقار کا خاکہ گویا ایک پل کا کام کر گیا۔

منظور وقار کے اجداد گلبرگہ کے چھوٹے سے گاؤں دستہ پور سے مراجعت کر کے گلبرگہ آبسے تھے ۔ان کے والد بزرگوار محمد مشائخ ملازم سرکار تھے ۔گلبرگہ میں منظور وقار نے 9/ڈسمبر 1953ء کو پہلی بار خارجی فضا کی ہوا اپنے پھیپھڑوں میں بھر کر روتے ہوئے اپنی آمد کا اعلان کیا تھا۔ان کی تعلیم خواجہ ہائی اسکول میں ہوئی ۔خواجہ ہائی اسکول کے استاد سعادت الدین قریشی مرحوم نے منظور وقار کو علم وادب کی طرف راغب کیا۔ان کی طالب علمی کے زمانے میں اسکول سے ایک رسالہ شاہین شائع ہوا کرتا تھا۔اس کے ایک شمارے میں منظور وقار کا افسانہ 'انسانیت کی موت' شائع ہوا تھا۔یہ بات 1971ء کی ہے منظور وقار طالب علمی کے زمانے میں مارکسی تنقید کے مشہور ناقد سید وقار عظیم کے نام سے متاثر ہوئے اور ان کے نام کا حصہ اپنے نام کے ساتھ لاحقے کے طور پر جوڑ لیا ۔دھارواڑ یونیورسٹی سے انھوں نے 1980ء میں ایم اے علم سیاسیات سے درجہ اول سے کامیاب کیا تھا۔شکم کی آگ انھیں گورنمنٹ کالج گلبرگہ لے گئی ۔وہاں انھوں نے مختلف ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ابھی ان کی ادبی کارگذاریاں عروج پر تھیں کہ مستقل ملازمت کے سلسلے میں

منظور وقار عادل شاہوں کے شہر بیجاپور کے مختلف تعلقوں میں غم روزگار کوغم کائنات میں تبدیل کرتے ہوئے ڈپٹی تحصیلدار کے عہدے سے سبکدوش ہوکر 2013ء میں جہاں سے چلے تھے وہاں لوٹ آئے۔یعنی گلبرگہ میں آموجود ہوئے۔اب کوئی دن نہیں جاتا منظور وقار سے ملاقات نہ ہوتی ہو۔

منظوروقار بھلے مانس ہیں۔ان کی اُردو ادب کے ساتھ مخلصانہ اورغیر مشروط محبت ہے۔ملنساری،سادگی،خوش خلقی اور اخلاق کے بلندمرتبے پر فائز ہیں ۔گلبرگہ ان کا وطن ہے۔طنزوظرافت ،خاکہ،افسانہ،افسانچہ،انشائیہ،تبصرہ،رپورتاژ مضامین اور بچوں کا ادب ان کا فن ہے۔لڑکپن میں جو چنگاریاں منظور وقار میں سلگی تھی وہ آج شعلہ بن چکی ہیں۔منظور وقار بہتر جانتے ہیں کہ ادبی کام نوجوانی میں کرنے ہوتے ہیں اور اس کی شہرت عمر کے آخری حصہ میں آتی ہے۔ان کا لہوگرم ہے۔انھوں نے جتنا لکھا اسی میں انھیں عزت بھی ملی۔لکھنا پڑھنا ان کا شریک سفر ہے۔بے ریا قلب ،قلندرمزاج،بے نیازی،رچا ہوا ذوق اور کبھی نہ ختم ہونے والا اضطراب منظوروقار میں پایا جاتا ہے۔

ایک دن سرشام میں نے ان سے ایک سوال کیا تھا کہ علامتی یا تجریدی افسانے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں بتایا کہ گلبرگہ کی کسی ادبی محفل میں انھوں نے پروفیسر حمید سہروردی سے ان کا افسانہ سمندر سنا تھا۔افسانہ سمندر کا ایک اقتباس ان کو اس قدر انگیز کر گیا کہ وہ تجریدی اور علامتی افسانے پڑھنے لگے۔میں نے منظوروقار سے دریافت کیا کہ افسانہ سمندر کا وہ کون سا اقتباس ہے جو آپ کے دل میں اتر گیا تھا۔وہ گویا ہوئے:''سمندر کے اندر ایک چھوٹی سی مچھلی کو مگرمچھ گھیرے ہوئے ہے مچھلی چیختی ہے اطراف کی سہمی ہوئی مچھلیاں اس کی مدد کرنے سے معذور ہیں کیوں کہ انھیں اپنی جسامت کا احساس ہے۔''

منظور وقار اب تک 200 افسانے تخلیق کر چکے ہیں ۔ افسانچوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے ۔ جوگندر پال،انتظار حسین ،بلراج مین را،انورسجاد،سریندر پرکاش اور قمراحسن کے افسانے انھیں پسند ہیں ۔عام زندگی میں انھیں محبت خلوص اور سادہ مزاج اشخاص پسند ہیں ۔منافق ،جھوٹی شان والے حضرات ان کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں ۔منظوروقار کو جوگندر پال کا آشیرواد حاصل رہا ہے ۔آں جہانی نے اپنے ایک مکتوب میں منظوروقار کو ہدایت کی تھی کہ آپ میں لکھنے پڑھنے کا شوق وذوق بہت ہے مگر ادب میں نروان جنون کے بغیر ممکن نہیں ہے ۔منظوروقار نے جوگندر پال کی صائب رائے کو ذہن نشین کرلیا۔اور لکھنے کو رفتار دی۔ان کے لکھے کی ایک تاریخ بنے گی کیوں کہ ان میں تاب رقم ہے ۔بقول غالب ''لرزے ہے موج مئے تری رفتار دیکھ کر'' ۔

منظوروقار کی انگلیاں زندگی بھر صرف اور صرف لکھنے کا کام انجام دیتی رہیں۔کتاب جستہ برجستہ کے خالق امجد علی فیض مرحوم نے کہیں لکھا ہے کہ ''منظوروقار کے ہاتھ ہی میں نہیں بلکہ ہر انگلی میں قلم پوشیدہ ہے۔''

منظوروقار ماہر تیراک ہیں ۔یونیورسٹی سطح پر مقابلہ تیراکی میں انعام اول سے سرفراز ہوئے تھے ۔سگریٹ، بیڑی، پان کے ذائقے سے ناآشنا منظور وقار کا چند برس تک سیندھی کا ذائقہ ہم سفر رہا۔مکیش اور طلعت محمود کی آوازیں خلوت میں ان کے کانوں میں رس گھولتی رہی۔فلم نگری میں دلیپ کمار اور سمیتا پاٹل کی غیر معمولی اداکاری سے متاثر ہوئے۔صورت وشکل سے صحت مند نظر آنے والے منظوروقار آپریشن بھی جھیل چکے ہیں۔

منظور وقار اپنے خاندان کے پہلے گرایجویٹ اور پوسٹ گرایجویٹ ہیں ۔والدین کے منظور نظر رہے ان کے عقد نکاح میں والدین نے تاخیر کی ۔خانگی زندگی انتہائی خوش گوار رہی۔نصف بہتر ہی ان کی زندگی میں آنے والی اول وآخر خاتون ہیں۔کبھی کبھی منظوروقار عالم تنہائی اپنی پسندیدہ اداکارہ سمیتا پاٹل کا نغمہ گنگناتے ہوئے اپنی اہلیہ محترمہ سے کہتے ہوں گے:

جنم جنم کا ساتھ ہے تمہارا ہمارا
اگر نہ ملتے اس جیون میں لیتے جنم دوبارہ

منظور وقار نے فرزندان اور بیٹی کو عصری علوم سے روشناس کرواتے ہوئے اعلیٰ تعلیم دلائی۔ان کے بچے اُردو اور انگریزی میڈیم سے تعلیم یافتہ ہیں۔منظور وقار کے ایک فرزند کی بے وقت موت نے ان کی ہنگامہ پرور زندگی میں خلا پیدا کیا۔جگر گوشے کے سانحہ انتقال کے بعد ان کا قلم و قرطاس سے رشتہ ایک مدت تک نم رہا۔

منظور وقار محتاط انسان ہیں۔گنے چنے احباب سے گہرے مراسم ہیں۔اس قدر احتیاط کرتے ہیں کہ دامن پر داغ نہ لگ جائے۔بعض داغ اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ دامن پر سوراخ پڑ جاتا ہے۔احتیاط علاج سے بہتر ہے اس پر وہ کاربند ہیں۔

منظور وقار لکھنے کے علاوہ تقریر اور نظامت بھی کرتے ہیں۔تقریر میں اس بات کا لحاظ رکھتے ہیں کہ موضوع سے انصاف کیا جائے۔عالمی ادب کے مغربی قلمکاروں کی بات نہیں کرتے۔ان کو اپنی حدوں کا انداز بہ خوبی ہے۔نظامت کے دوران عمدہ اور مشہور زمانہ اشعار کا برمحل استعمال کرتے ہیں۔جب وہ انشائیے یا افسانچے سناتے ہیں تو حاضرین سے فلک شگاف قہقہے بلند ہوتے ہیں۔منظور وقار کے متعلق شہر گلبرگہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ طنز و مزاح کے Icon ہیں۔ان کی تحریریں حیرت انگیز رعایت لفظی کی عمدہ مثالیں ہیں۔اگر وہ نیند میں بھی ہوں تو ذہنی قلم رواں ہوتا ہے۔منظور وقار کوئی غیر معمولی فن کار نہیں ہیں لیکن وہ معمولی بھی نہیں کہ ہم انہیں نظر انداز کر دیں۔وہ انہماک اور لگن سے ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔اسی لئے ان کا نام اور کام دور دور تک جا پہنچا ہے۔اگرچہ انھیں حاشیائی زبان کی خدمت سے راتوں کی سیاہی کے سوا کچھ نہ ملا۔

منظور وقار کے تعلق سے ڈاکٹر حشمت فاتحہ خوانی نے ایک اجلاس میں تعارف کرواتے ہوئے کہا ''حمید الماس،حمید سہروردی کے بعد شہر گل و برگ سے سب سے زیادہ شائع ہونے والے ادیب منظور وقار ہیں۔''

منظور وقار صوم و صلوٰۃ کے پابند،خوش عقیدہ اور خوش اوقات مسلمان ہیں۔سادہ لباس اور سادہ غذا کے شوقین ہیں۔ادب سے انھیں اس قدر مخلصانہ وابستگی ہے کہ بس اسٹاپ کے بنائے گئے ٹین شیڈ ، بسوں اور ٹرین میں بھی بیٹھ کر لکھتے رہتے ہیں۔شاید اس خیال سے کہ ہم نہ رہیں گے لفظ ہمارے رہ جائیں گے۔اپنا ذاتی گھر ابھی تک نہیں بنایا ہے اس خوف سے کہ دنیا سرائے فانی ہے یا اپنے نقشے کے مطابق زمین کچھ کم ہے۔منظور وقار کی تحریرات عصری مسائل معاشرتی دکھ درد سے مزین ہوتی ہیں۔تاریخی واقعات اور تاریخی کرداروں کو پیش کرنے کا سلیقہ منظور وقار کو خوب آتا ہے ان کے چند مضامین میں سیاست اور سیاسی لیڈران پر گہری چوٹ اور طنز کا پہلو نمایاں ہے۔حاجی بغلول اور حاجی معلق کی طرح ان کی تحریروں میں علامہ پاگل پاکھنڈی اور علامہ کاروباری کے کرداروں نے چودہ طبق روشن کیے ہیں۔منظور وقار کے افسانچے ہندی اور پنجابی زبان میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ان کے افسانچوں میں نوکیلے کانٹے ہوتے ہیں جن کی چبھن کا احساس دھیرے دھیرے ہوتا ہے اور کانٹوں کو مرجھانے کا خوف بھی نہیں ہوتا۔ان کے افسانچے سدا بہار رہیں گے کیوں کہ ان میں ظریفانہ تیکھا پن بھی ہے اور لطیف طنز بھی۔منظور وقار نے فن افسانچہ میں خود کو جھونک دیا ہے۔ان کے افسانچوں کے ہزار رنگ ہیں اور ہر رنگ جداگانہ حیثیت رکھتا ہے جس میں زندگی سے جڑی کہانیاں راہ پا جاتی ہیں۔ان کے یہاں فطری اور سچا اظہار رنگ اور روشنی کا استعارہ ہے۔

منظور وقار کی تحاریر میں برق رفتاری کے باعث کچھ کمیاں ضرور رہ جاتی ہیں مگر چاندنی کا نظارہ کرتے ہوئے چاند کا داغ دیکھا نہیں جاتا۔منظور وقار کی تحریر میں تنوع ہے۔بے غرض کام کرنے کا جذبہ ان کے ہاں ہے۔وہ عالم کاری کے عہد میں حاشیہ نشین زبان اُردو کی خدمت کر رہے ہیں۔فنا فی الادب ہیں۔ان کا یہ سفر طویل عمر تک جاری رہے بقول احمد سوزؔ

نیند بھی کرتی ہے حیران بہت
آدمی چین سے کب سوتا ہے

ڈاکٹر رزاق اثر شاہ آبادی
9632881869

قلم و قرطاس کا راکٹ : منظور وقار

جس منظور وقار کو میں گذشتہ پچاس برسوں سے جانتا ہوں اور پہچانتا ہوں وہ آج ادبی دنیا میں تعارف محتاج نہیں ۔طنز و مزاح ، تبصرہ نگاری اور ابتدائی دور کی بے وزن و بے بحر شاعری کے میدان میں وہ مجھ سے چالیس قدم آگے ہیں ۔ان کی خدمات کا اعتراف شہر کی مختلف اردو انجمنوں نے مختلف موقعوں پر تو کیا ہے لیکن ان کے شایان شان اعتراف ابھی باقی ہے ۔حیرت کی بات تو یہ ہے کہ بنگلور ، میسور ، شولا پور ، بیجا پور اور تالیکوٹ کی اردو تنظیموں نے ان کی خدمات کا اعتراف مختلف ادبی اجلاسوں میں (مختصر طور پر سہی) کر کے اپنے شہر کا نام ادب نواز شہروں میں شامل کرلیا ہے ۔منظور وقار کا دور شباب کس قسم کا تھا اس کا تو مجھے پتہ نہیں ،صورت شکل سے تو ایسا نہیں لگتا کہ دور شباب میں انہوں نے کچھ ' گل' یا گل تازہ' کھلائے ہوں گے البتہ ان کا دور شباب ادب شاندار ہے ۔ان کے ادبی ذوق کی ابتداء 1978 میں ...... افسانہ نگاری اور مزاح نگاری سے ہوئی ۔ جب انہیں کرشن چندر ، خواجہ احمد عباس ، بیدی اور ابراہیم جلیس کے افسانوں کے مطالعہ کی چٹ لگ گئی تو ان کی افسانہ نگاری دھڑلے کے ساتھ چل پڑی ۔علاوہ ازیں ان کے اندر طنز و مزاح نگاری اور خاکہ نگاری کے جراثیم بھی پتہ نہیں کتنے برسوں سے منھ چھپائے بیٹھے تھے کہ وہ افسانہ نگاری اور افسانچہ نگاری کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح نگاری ، خاکہ نگاری اور تبصرہ نگاری کی راہ پر بھی چل پڑے ۔ ان کے والدین نے دیکھا کہ ان کا لڑکا قلم و قرطاس کے چکر میں ہاتھ سے نکلا چلا جارہا ہے انہوں نے منظور وقار کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا ۔گھر گرہستی کی ذمہ داریاں گردن میں طوق زنداں کی طرح پڑ گئیں ادھر قدرت بھی مائل بہ کرم تھی کہ گھر آنگن غٹرغوں کی صداؤں سے گونج اٹھا ۔ جہاں تک منظور وقار کی خاکہ نگاری کا تعلق ہے صاحب خاکہ کا ایسا جم کر خاکہ اڑاتے ہیں کہ وہ بھی اس انداز دلیرانہ و دلکشی کے ساتھ کہ جس پر خاکہ لکھا گیا وہ اس بات پر حیراں کہ ان کے ذاتی خانگی ادبی و غیر ادبی حتی کہ ان کی حرکات و سکنات کا بھی انہیں کس طرح پتہ چل گیا ؟ اور کب انہیں درون خانہ میں تانک جھانک کا موقع ملا ۔۔

ہم نے دیکھا ہے کہ اکثر قلم کار مونچھ منڈے ہی رہنا پسند کرتے ہیں لیکن منظور وقار دور شباب کی آمد کے ساتھ ہی یہ مونچھ کو سنوارنے اور سجانے میں مہارت حاصل کر چکے ہیں ۔ خاص کمال یہ ہے کہ سر کے بالوں کی طرح مونچھ کے بالوں کو بھی سفید ہونے نہیں دیتے ۔ گودریج کمپنی کو پتہ چلے تو منظور وقار کی مونچھ کی مختلف زاویوں سے تصویریں لے کر اخبارات اور ٹی وی چینلوں میں اشتہار دیں گے ۔ یہ کمال خضاب کا نہیں بلکہ منظور وقار کی مونچھوں کا ہے کہ نہ کبھی کسی کے آگے یہ جھکی ہے نہ سر۔ ان کے غیر سنجیدہ چہرے پر آج کل داڑھی کا بھی اضافہ ہوگیا ہے (گویا سونے پہ سہاگہ ہے) جہاں تک ان کی تصانیف کا معاملہ ہے ان کی نثری تخلیقات کی تعداد سینکڑوں میں ہے لیکن ملازمت کی بے انتہا مصروفیات نے انہیں کتابوں کی اشاعت کی اجازت نہیں دی ۔تاہم کرناٹک اردو اکیڈیمی بنگلور نے ان کی دو کتابیں ' ہنسنا منع ہے' (1990) اور ' کانٹوں کا جھنڈ (2015) شائع کر کے انہیں مصنف کہلانے کا حق دار بھی بنا دیا ہے ۔منظور وقار 2014 میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر گلبرگہ لوٹ آئے ہیں ۔

دور سبکدوشی میں چبوتروں پر بیٹھ کر چکار کھیلنے کے بجائے خود کو مصروف رکھتے ہوئے طنز و مزاح ، افسانے ، افسانچے ، خاکے ، تبصرے اور بچوں کی کہانیوں پر مشتمل کوئی پندرہ عدد تصانیف ترتیب دے چکے ہیں ۔ایک خاکوں کی کتاب ' آفتاب ہیں ہم لوگ ' اور ایک طنزیہ و مزاحیہ مضامین کی کتاب ' مسکرانا منع ہے ' بہت جلد منظر عام پر آنے والی ہے ۔ ویسے مسلسل لکھنے اور چھپنے کا ریکارڈ محمد علی کلے (مشہور مکے باز) جیسا ہے ان کے مسلسل لکھنے اور ملک بھر کے اخبارات اور رسائل میں چھپنے کی رفتار دیکھ کر کہنا پڑتا ہے منظور وقار قلم و قرطاس کے راکٹ سے کم نہیں ۔ ان کے طنز و مزاحیہ مضامین کو ادبی محفلوں میں سن کر باذوق سامعین کے ساتھ ساتھ بے ذوق سامعین بھی واہ واہ کرتے ہیں ۔ ان کے طنز کے مکے محمد علی کلے کے مکوں سے بھی زیادہ طاقت ور ہوتے ہیں ۔منظور وقار کی خوبیوں کا علم تو سب کو ہے لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا قلم ہمیشہ چلتا ہے (سانسوں کی رفتار کی طرح) ان کی تحریر کی ہر سطر نمازیوں کی صف کی طرح کبھی سیدھ میں نظر نہیں آتی ، ان کی Active اسکوٹی بھی تیڑھی میڑھی چلتی ہے ۔کبھی سڑک پر چڑھتی ہے تو کبھی کسی گڑھے میں اترتی ہے ۔ ہمیں بھی دوبار ان کی اسکوٹی پر بیٹھ کر (پیچھے سیٹ پر ۔) گلبرگہ کی گلیوں کا لطف اٹھانے کا موقع ملا ہے ۔اس تجربہ کے بعد پتہ چلا منظور وقار کی تحریر لائننگ پیپر پر بھی آڑھی ترچھی کیوں ہوتی ہے ۔ ان کے طنز و مزاح کی دھوم تو پچھلے چالیس برسوں سے ہے ان کے افسانچوں کی دھوم بھی پچھلے تیس برسوں سے دنیائے ادب میں ڈنکے بجا رہی ہے ۔گلبرگہ کی ادبی انجمنوں کو جشن منظور وقار نہ سہی جشن افسانچہ نگاری تو ضرور منانا چاہئے ۔منظور وقار ظاہری و باطنی نازنخروں سے دور ملنسار قسم کے قلم کار ہیں ۔ ہر محفل میں موجود ہر انجمن کے عہدے داران سے ان کے تعلقات ہیں ۔ شاید مخدوم محی الدین کے اس شعر کو منظور وقار نے دل میں جگہ دے دیا ہے ۔۔

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

منظور وقار کو گلبرگہ کی ہر گلی پہچانتی ہے ۔گلبرگہ کے ادب نواز لوگ اس لیے پہچانتے ہیں کہ منظور وقار گذشتہ پچاس برسوں سے نہ صرف تواتر سے لکھ رہے ہیں مقامی اخبارات کے علاوہ ملک اور بیرونی ملک کے ادبی رسائل میں چھپ رہے ہیں اس کے باوجود منظور وقار کے چہرے پر تھکان نظر آتی ہے اور نہ ان کا قلم تھکا ہے ۔ان کا قلم فی گھنٹہ پانچ سو کلومیٹر رفتار سے دوڑ رہا ہے گویا ان کا قلم قلم نہیں ریس کورس کا گوڑا ہے ۔ان کی خدمات کا کوئی اعتراف کرے یا نہ کرے ان کے قلم کی دھار تیز ہی رہے گی ۔ان کے قلم کو کوئی قدغن لگا نہیں سکتا ۔ وہ جب چاہیں طنز و مزاح خاکے اور تبصروں کو ادب کے کٹہرے میں کھڑا کر سکتے ہیں ۔انہیں اس بات کی فکر نہیں کہ ادب کے جج صاحبان کیا فیصلہ دیں گے ۔صرف مدح سرائی کرنا انہیں نہیں آتا جب کسی کا خاکہ بناتے ہیں تو طنز و مزاح کی آڑ میں صاحب خاکہ کی تعریف کرتے کرتے کچو کے بھی لگاتے ہیں کہ چوٹ کھانے والا بھی خوش کہ کتنی دلچسپ اور دلکش چوٹیں لگائی ہیں ۔ ان کے خاکوں کو پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے منظور وقار کی یادداشت بلا کی تیز ہے ۔منظور وقار دوستوں کی محفلوں میں بے باک بے لاگ اور سیدھی سادھی گفتگو کرتے ہیں کچھ ایسے جملے ادا کرتے ہیں کہ محفل قہقہہ زار ہو جاتی ہے ۔جس محفل میں ہوتے ہیں اس محفل کا حصہ بن جاتے ہیں ۔گلبرگہ کے لوگ جشن خطیب ، جشن محبّ کوثر اور جشن وہاب عندلیب دیکھ چکے ہیں اب جشن منظور وقار کے منتظر ہیں ۔ میں اچھا خاصا شاعر تھا آدھا درجن شعری مجموعوں کا خالق مجھے شاعری کے میدان سے ورغلا کر طنز و مزاح کے میدان میں لانے میں کم کم ہی سہی ان کا بھی ہاتھ ہے ۔ اگر وہ ہمارے دواخانے پر یونہی حاضری دیتے رہیں تو پتہ نہیں مجھے مزید کس کس میدان میں اتاریں گے ۔ منظور وقار ابن صفی ، ساحر لدھیانوی کے معتقد بھی ہیں ، پطرس بخاری سے لے کر مشتاق احمد یوسفی کے طرفدار بھی اور تو اور منظور وقار کے سر پر ابن انشا ، کرشن چندر اور یوسف ناظم کی طنز و مزاح نگاری بھی سوار رہتی ہے ۔ ہم چونکہ شاہ

آباد کے متوطن ہیں اور شاہ آباد منظور وقار کا سسرال ہے اس لیے وہ ہمارے طرف دار بھی ہیں اور معتقد بھی۔ اکثر کہا کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب آپ کی اور صابر شاہ آبادی صاحب کی تحریروں کو اخبارات اور رسائل میں پڑھتے پڑھتے مجھے بھی لکھنے اور چھپنے کا شوق پیدا ہوا۔ گلبر گہ کے آسمان ادب پر یوں تو کئی ستارے اپنی آب و تاب سے دنیائے ادب کو چکا چوند کر چکے ہیں لیکن ان دنوں منظور وقار نامی قلمی ستارہ آسمان ادب پر پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے۔۔

بقول حضرت شفا گوالیاری:

نظر والے نہیں کرتے جہاں میں کچھ جہاں گردی
اٹھا کر ایک ذرہ نبض عالم دیکھ لیتے ہیں

اگر کوئی کرکٹ کا کھلاڑی کرکٹ میں میدان میں چار چھ سنچریاں ...... بناتا ہے تو پھولوں ٹرافیوں اور نوٹوں میں نہلایا جاتا ہے۔ منظور وقار قلم کی بیاٹ سے تواتر چوکے چھکے لگا کر سنچریوں پر سنچری بناتے جا رہے ہیں۔ سلیمان خطیب، ابراہیم جلیس، محبّ کوثر، وہاب عندلیب اور حمید سہروردی کے بعد منظور وقار نے گلبر گہ کو ایک نئی پہچان دی ہے۔۔

☆......○......☆

سلیمان خطیب کے مجموعہ کلام کا تازہ ایڈیشن

کیوڑے کا بن

قیمت 150 روپے

ناشر:

سلیمان خطیب امدادی ٹرسٹ

خطیب کاٹیج، سٹرم روڈ، اکسٹنشن

گلبر گہ 583105

ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی (لکھنو)

''آپ کی کتاب ہنسنا منع ہے میں نے پڑھی بہت لطف آیا۔ طنز یہ ومزا حیہ ادب اُردو زبان کا طرہ امتیاز ہے۔ ہندوستان کی کم زبانیں ایسی ہیں جن میں طنز ومزاح کا وہ معیار ملتا ہے جو اُردو نے قائم کیا ہے۔ آپ کے یہاں زبان کی شوخی ہے اور آپ کے مزاح میں تازگی اور طباعی ہے۔ شاعروں کے خطوط بہت خوب ہیں۔ حرفِ آخر بھی دلچسپ ہے۔ اُمید ہے آئندہ بھی آپ ایسی تحریریں پیش کرتے رہیں گے۔''

(تبصرہ بذریعہ مراسلہ (1990-12-11)

☆☆☆

یوسف ناظم (بمبئی)

''سلیمان خطیب اور مجتبیٰ حسین کے بعد گلبر گہ میں منظور وقار نے خوش مزاجی اور چہل کی دوکان کھولی ہے اور رنگین غباروں اور پھریروں سے سجایا ہے لیکن اس دوکان پر جو سائن بورڈ لگایا ہے اس پر لکھا ہے ''ہنسنا منع ہے'' یہ اعلان بذات خود اذان تبسم اور دعوت قہقہہ ہے۔''

(ہنسنا منع ہے (1990-3-5)

احمد جلیس (بنگلور)

''منظور وقار طیب انصاری کے شاگرد رہے ہیں استاد اور شاگرد میں یہی ایک قدر مشترکہ نظر آتی ہے کہ یہ دونوں چونکا دینے والی نثر لکھنے پر مہارت کاملہ رکھتے ہیں۔ ڈھلی ڈھلائی مروجہ نثر سے انحراف گویا ان کی انفرادیت ہے۔ انہیں جو بات کہنا ہے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے ان کے پاس اپنی ذاتی لفظیات کا ایک وافر ذخیرہ موجود ہے۔ منظور وقار طنزیہ ومزاحیہ مضامین میں جس کا استعمال کمال ہنرمندی اور روانی سے کرتے ہیں۔''

......☆......

منظور وقار
گلبرگہ
9731428416

کاروں کی کارستانیاں

موٹر کار بس سے چھوٹی ،آٹو رکشا سے قدرے بڑی ہوتی ہے چکنی چمکدار خوبصورت اور خوش رنگ کار، سرکاری بس ،ٹرک اور ٹریکٹر کے سامنے کھڑی ہوتی ہے تو لگتا ہے خوبصورت کم عمر اور منچلی فلمی ہیروین اپنے بے ڈول بھدی ممی (ماں) کے قریب کھڑی ہے۔

موٹر گاڑیوں میں موٹر کار کی اپنی اہمیت تو ہوتی ہی ہے ۔موٹر کار استعمال کرنے والے کارنشینوں کے مقام اہمیت اور گھمنڈ میں بھی اضافہ ہوتا ہے بھلے ہی کار نشین عالم ہوں کہ جاہل،انگوٹھا چھاپ ہوں کہ کتا چھاپ (کتا چھاپ دارونوش فرمانے والے)

کار اکثر کاروباری لوگ رکھتے ہیں کیونکہ کاروباری لوگوں کو کاروبار کے سلسلے میں کہاں کہاں بھٹکنا پڑتا ہے کس کس منسٹر یا افسر اعلیٰ کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے اس راز سے ان کا ڈرائیور واقف ہوتا ہے یا ان کے ائیر کنڈیشنڈ آفس میں کام کرنے والی جواں سال کمپیوٹر آپریٹر کم پرسنل سیکریٹری ۔کاروباری لوگوں کو کار میں گھومنا ضروری ہوتا ہے ورنہ کار کے بغیر کاروبار ٹھپ ہوجانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔دراصل چند خفیہ قسم کے کاروبار کا دار و مدار ہی کار پر ہوتا ہے مثلاً سونا ،گانجہ ،افیم ، چرس کی اسمگلنگ ، الیکشن کے دوران رائے دہندگان کو خریدنے کی رقم سے بھرے سوٹ کیس لانے لے جانے کے لیے کار ہی سب سے کارآمد گاڑی ثابت ہوتی ہے۔کار کاروباری لوگوں کے علاوہ فلمی ہیرو ہیروین ،فلم ڈائریکٹر اور پروڈیوسر بھی استعمال کرتے ہیں۔لیکن ہیرو ہیروین کی کاروں کو دیکھتے ہی لوگ خصوصاً نوجوان پاگل ہو کر کاروں کو ہی گھیر لیتے ہیں۔اس صورت حال میں ہیرو ہیروین خصوصاً ہیروین کی عزت خطرہ میں نظر آنے لگتی ہے۔اس سے پہلے کہ کوئی فلموں کا جنونی ہیروین کے گال کترنے میں کامیاب ہوجائے فوراً پولیس پہنچ کر نوجوانوں کو نو دو گیارہ کردیتی ہے۔کاروں کا استعمال سیاسی قائدین اور افسر اعلیٰ بھی کرتے ہیں۔لوگ سیاسی قائدین کی کاروں کو دیکھتے ہی جمع ہونے لگتے ہیں جب کہ افسر اعلیٰ کی کاروں پر نظر غلط تک نہیں ڈالتے کیونکہ سفید پوش سیاسی قائدین کی شخصیت میں جو جاذبیت ہوتی ہے ایسی کشش گنجے سر افسر اعلیٰ کی شخصیت میں کہاں؟ سیاسی قائدین اور افسر اعلیٰ کے مقام عہدے اور عزت میں اچانک اس دن اضافہ ہوجاتا ہے جس دن ان کی کاروں پر سرخ لائٹ لگ جاتی ہے۔لوگ سرخ لائٹ لگی کاروں میں گھومنے والے کارنشینوں سے زیادہ ان کی کاروں سے ڈرتے ہیں۔ویسے بھی ہمارے ملک میں معصوم لوگوں کو ڈرانے یا ایک مخصوص اقلیتی طبقے میں دہشت پھیلانے اس طبقے کے معصوم نوجوانوں اور خواتین پر حملہ کرنے کے لیے سرخ رنگ کا جھنڈا اور بھگوا لباس کافی کارآمد ثابت ہورہا ہے۔

کاروں کی تاریخ سے ہم واقف نہیں (ہم خود اپنی تاریخ پیدائش سے واقف نہیں تو بھلا دُنیا بھر کی تاریخوں کا ہمیں کیا پتہ ہوگا)ہاں ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ (ہوسکتا ہے ہماری یہ معلومات ناقص ہوں) ہمارے دیش بھارت میں کاروں کی آمد انگریزوں کے زمانے میں ہوئی تھی ۔صرف انگریز وایسرائے ہی کاروں میں گھومتے تھے۔ان دنوں پنڈت جواہر لال نہرو کا لڑکپن تھا۔انہوں نے اپنے والد سے کار دلانے کی ضد کی تو ان

کے والد موتی لال نہرو نے جواہر لال نہرو کو کار دلا کر جہاں انگریزوں کو حیران کردیا تھا وہیں غلام ہندوستان کے غریب ہندوستانیوں کا سر فخر سے اُونچا کردیا تھا۔

ایک زمانہ تک سیٹھ ساہوکار منسٹر، سیاسی قائدین اور افسر اعلیٰ ہی کار رکھتے تھے۔ادھر چند برسوں میں دولت کی کھنا کھن اتنی بڑھ گئی ہے کہ ہر عام آدمی اپنے ساتھ ایک عدد کار اور ایک عدد اسمارٹ موبائیل فون رکھنے لگا ہے۔کاروں کا استعمال زیادہ تر ڈاکٹروں، مٹھوں کے مکھیا سادھو سنت اور سوامی کرتے ہیں۔علاوہ ازیں خادم قوم وملت عالم دین، شعلہ بیان واعظ اور سماج سیوک بھی کار میں گھومنے کو ہی اپنی شان سمجھتے ہیں۔آج کل مندروں کے پجاری، درگاہوں کے مجاور بھی کار رکھنے لگے ہیں۔یہ لوگ کار کیوں نہ رکھیں گے پجاریوں اور مجاوروں کی روزانہ آمدنی ہزاروں میں پہنچ گئی ہے۔دور ماضی کے سادھو سنت اور پنڈت بھاشن کیرتن کے لیے دھرم سبھا میں پیدل آیا کرتے تھے، اسی طرح اس دور کے عالم دین اور واعظ نورانی محفلوں اور جلسوں کو مخاطب کرنے کے لیے چل کر آیا کرتے تھے یا سائیکل رکشاؤں میں۔آج کل نام نہاد مقدس ہستیاں ایسی شاندار کاروں میں جلسہ گاہ پہنچتی ہیں کہ انہیں دیکھ کر منسٹر برائے مالگذاری کی آمد کا شک ہونے لگتا ہے۔خصوصاً جب شعلہ بیان واعظ بذریعہ کار جلسہ گاہ میں پہنچتے ہیں تو ان کی آمد پر نوجوان ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر بلند آواز میں نعرہ تکبیر بلند کرنے لگتے ہیں سارا ماحول گرما جاتا ہے۔نعروں کے درمیان مولانا کار سے اتر کر جوں ہی ڈائس پر پہنچتے ہیں انہیں پھولوں اور ہاروں سے لاد دیا جاتا ہے۔

کاریں دو قسم کی ہوتی ہیں۔بدیسی کاریں اور دیسی کاریں۔بدیسی کاروں کی اندرونی اور بیرونی حالت قابل رشک ہوتی ہے۔خوبصورت اور جاذب نظر سراپا، گدے دار سیٹیں مخمل کا میاٹنگ، ایش ٹرے، گلوبکس، کیارئینگ بیاگ، سن شیڈ، رنگین گلاس کے ونڈو آٹو میٹک سسٹم کے لاکر، ڈبل ہارن، ٹی۔وی اور دیگر بے شمار سہولتوں سے آراستہ۔بدیسی کاریں ائیر کنڈیشنڈ تو ہوتی ہی ہیں واٹر پروف و بلٹ پروف بھی۔بدیسی کاریں بٹن دباتے ہی ہوا سے باتیں کرنے لگتی ہیں۔ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طئے کرنے کے باوجود بھی نہ گرم ہوتی ہیں اور نہ چیختی چلاتی ہیں۔اپنے مالک اور مالکن کی طرح ہشاش بشاش تروتازہ ہی نظر آتی ہیں۔بدیسی کار میں سفر کرنے والے اکثر اپنے ساتھ ایک ہرن جیسی آنکھوں والی خاتون اور ایک السیشین کتا ضرور رکھتے ہیں کیونکہ بدیسی کاروں کی آن بان شان اور اُٹھان میں اضافہ کے لیے سفید رنگ کا کتا اور سرخ گالوں والی خاتون کی موجودگی ضروری ہے۔

ان دنوں ہمارا ملک آٹو موبائیل ٹیکنک کے میدان میں اتنی ترقی کر چکا ہے کہ اب مالدار لوگ بدیسی کاروں کے بجائے دیسی کاروں میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔کیونکہ ہمارے ملک کے آٹو موبائیل انجینئر بدیسی کاروں کی اس خوبصورتی کے ساتھ نقل کرنے لگے ہیں کہ دیسی کاروں پر بدیسی کاروں کا اور بدیسی کاروں پر دیسی کاروں کا گمان ہونے لگا ہے۔چند کار کمپنیاں بدیسی کاروں کی نقل تیار کرنے کو بھی وقت اور محنت کی بربادی سمجھ رہے ہیں۔انہیں ایک آسان راستہ مل گیا ہے۔وہ بدیسی کاروں پر میک ان انڈیا کا سکہ لگا رہے ہیں۔دراصل یہ لوگ ہمارے وزیر اعظم کے نعرے ’’میک ان انڈیا‘‘ پر عمل کررہے ہیں۔چند لوگ کار رکھنے کے قابل ہوتے ہیں کیونکہ ان لوگوں کا بینک بیلنس تگڑا اور تجوری بھاری ہوتی ہے۔چند لوگ مالی اعتبار سے اتنے کنگال ہوتے ہیں کہ کار رکھنا تو بڑی بات ہے کار کا ایک ٹائر بھی نہیں خرید سکتے تاہم ان لوگوں کو کاروں میں گھومنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔یہ لوگ کار نشینوں سے دوستی کرلیتے ہیں وقت پڑا تو کپڑے سے کار کی دھول صاف کرتے ہیں۔ان کی اس خدمت کے عوض کار نشین انہیں بھی کبھی کبھی کار میں بٹھا کر گھماتے ہیں۔ یہ لوگ کار نشینوں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر کسی جلسے تقریب یا دعوت میں جاتے ہیں تو ان کے چہرے کی لالی اور تنی ہوئی گردن دیکھنے لائق ہوتی ہے۔آج کل سیکنڈ ہینڈ کار خریدنے کا شوق بھی بڑھ رہا ہے۔لوگوں کے اس شوق کے نتیجے میں سیکنڈ ہینڈ کاروں کی خریدو

فروخت کا بازار گرم ہے۔نئی کاروں کے ساتھ ساتھ سکینڈ ہینڈ کار خریدنے اور فروخت کرنے کی ہوا دراصل وبا کچھ ایسی چل پڑی ہے کہ کاروں کی بھیڑ میں یہ تمیز کرنا مشکل ہورہا ہے کہ کونسی کار نئی ہے اور کونسی کار سیکنڈ ہینڈ۔ ہمارے بزرگ دوست علامہ کاروباری نے بھی ایک عدد سیکنڈ ہینڈ کار خرید لی۔کار خریدتے ہی انہیں برسوں سے بھلائے ہوئے رشتہ دار اچانک یاد آنے لگے۔وہ ہر روز بذریعہ کار کسی دن ماموں کے گھر تو کسی دن خالہ کے گھر کسی دن چچا کے گھر تو کسی دن سسرال جانے لگے ہیں۔ایک دن اپنی سیکنڈ ہینڈ کار کو سسرال کے مکان کے سامنے کھڑی کرکے اس قدر زور زور سے ہارن بجانے لگے کہ کار کے اطراف بچوں کی بھیڑ جمع ہوگئی۔

ایک دن ہم نے علامہ کاروباری کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر پوچھا ”علامہ سسرال سے ملا ہوا مکان رہن رکھ کر سیکنڈ ہینڈ کار خریدنے کی ایسی کونسی مجبوری تھی“ علامہ بولے ” وقار پیدل پھرنے والوں کو دیکھ کر لوگ آنکھیں پھیر لیتے ہیں موٹر سائیکل سوار کو سلام کرتے ہیں۔کارنشین کو دیکھ کر لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ضرورت پڑنے پر کارنشینوں کو لاکھوں روپیئے قرض دیتے ہیں، بھلے ہی کارنشین قرض لے کر قرض دار کو ٹوپی ہی کیوں نہ پہنائے“۔علامہ کی باتوں میں ایسا دم تھا کہ ہم دم بخود ہوکر رہ گئے۔یہ بھی حقیقت ہے کہ جو سادھو سنت اور سوامی کاروں میں گھومتے ہیں ان کی قیام گاہوں اور مٹھوں کے آگے کاروں کی لمبی چوڑی قطار لگ جاتی ہے۔ سادھو سنت اور سوامیوں کے درشن کرنے کے لئے جو مرد و خواتین (خصوصاً خواتین) آتی ہیں وہ اکثر کارنشین ہی ہوتی ہیں۔مندروں کے سوامی ، درگاہوں کے گدی نشین اور مرشد بھی کاروں میں گھومنے لگے ہیں جو جتنی بڑی اور قیمتی کار رکھتا ہے ان کے در پر اتنی ہی بڑی تعداد میں دولت مند عقیدت مندوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔جو ڈاکٹر مریضوں کے مرض سے زیادہ قیمتی اور شاندار کار رکھنے پر توجہ دیتے ہیں ان کے پرائیوٹ اسپتالوں پر کارنشین مریضوں کی بھیڑ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

وہ دن لد گئے جب دولہا شادی کے وقت سائیکل موٹر کی ضد کرتا تھا۔آج کل دولہے سسرال والوں سے سائیکل کے بجائے کار مانگ رہے ہیں۔ان کے پاس پہلے ہی سے کار ہے یہ دکھانے کے لئے دولہے کار میں سوار براتیوں کے ساتھ دولہن کے پاس (شادی گاہ) پہنچتے ہیں یہ اور بات ہے کہ براتی دولہے کے ہوتے ہیں تو کار کرایہ کی۔کسی دور میں دولہا سہرے اور پھولوں میں لدا سفید گھوڑے پر سوار بیانڈ باجے اور براتیوں کے ساتھ دُولہن کے گھر پہنچتا تھا برخلاف اس کے آج کل اکثر دولہا تو سہرے اور پھولوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔البتہ اس کار کو پھولوں اور ہاروں سے سجایا جاتا ہے جس کار میں دولہے کی سواری نکلنے والی ہے۔بیانڈ باجہ تو نہیں ہوتا اس کی جگہ پٹاخے اور بارود کی آوازیں کان پھاڑتی ہوئی شادی محل کو دھواں دھار بنادیتی ہیں۔دُلہے کا گھوڑے کے بجائے کار میں سوار ہوکر شادی محل پہنچنا ضروری نہیں مجبوری بن گئی ہے۔کار کے بغیر دُولہا بے کار ہی نہیں ناکارہ سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں ادھر چند برسوں میں موٹر گاڑیوں خصوصاً موٹر کاروں کی اتنی بہتات ہوگئی ہے کہ کوئی سڑک اور گلی ان کے وجود سے خالی نہیں۔ایسا لگتا ہے سڑکوں اور چوراہوں پر چونٹیاں رینگ رہی ہیں۔ ہر طرف کاروں اور موٹر گاڑیوں کی بھیڑ ہی بھیڑ۔دہلی کے وزیر اعلیٰ اروند کیجروال نے دہلی میں موٹر گاڑیوں خصوصاً کاروں کے اژدھام پر قابو پانے کے لیے ٹرایفک نظام کے ایسے ایسے پاپڑ بیلے کہ اس کے آدھے بھی پاپڑ پارلیمانی الیکشن کے دوران بیلتے تو وزیر اعلیٰ کے بجائے وزیر اعظم کی کرسی پر ہوتے۔

کچھ لوگ سرکاری دفتروں اور کارخانوں کو جانے کے لیے کار رکھتے ہیں۔تو کچھ لوگ کار اس لئے رکھتے ہیں کہ وہ بھی کارنشین کہلائیں۔حالانکہ انہیں دفتر جانے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ کارخانے کو جانے کی کیونکہ یہ لوگ دولت مند گھر کے بے روزگار

داماد ہیں۔ یہ لوگ کار رکھ کر بھی بے کار ہوتے ہیں کار تو سسرال والوں نے دی ہے کار کا احسان چکانے کے لئے بیوی کا سر کبھی کبھی پیر بھی دبانے پڑتے ہیں۔ کبھی کبھی باورچی خانے میں باورچی کا ہاتھ بھی بٹاتے ہیں۔ یہ لوگ بنگلے کے اندر باورچی بابو، بنگلے کے باہر کار والے بابو کہلاتے ہیں۔ لوگ شہر میں پیدا ہو کر جوان ہو جاتے ہیں۔ لیکن انہیں خود ان کے شہر میں موجود تاریخی عمارتوں اور تفریح گاہوں کا دیدار نصیب نہیں ہوتا۔ ان کے پاس جب کار آجاتی ہے تو ان کے اندر شہر کی تاریخی عمارتوں اور تفریح گاہوں کے دیکھنے کا شوق اچانک جاگ اُٹھتا ہے۔ وہ ہر ہفتہ اپنی بیوی اور کبھی پڑوسی کی پرکشش بیوی کے ساتھ سیر سپاٹے کے لئے نکل پڑتے ہیں۔ کبھی کبھی اتنے لمبے لمبے سفر کرتے ہیں کہ مکان واپس آتے ہیں تو کار میں ان کے ساتھ ایک اجنبی خاتون ہوتی ہے بعدازاں یہ خاتون ان کی چھوٹی بیوی بن جاتی ہے۔ اگر کوئی نوجوان دس برس تک سعودی عرب میں بکریاں چرا کر وطن لوٹتا ہے تو رشتہ داروں پر رُعب جمانے کیلئے ایک عدد کار خرید لیتا ہے اور پھر اسی کار میں بیوی بچوں کے ساتھ کشمیر اور کنیا کماری دیکھنے نکل جاتا ہے۔ خوش قسمت ہے تو کار اور بیوی بچوں کے ساتھ وطن لوٹتا ہے ورنہ سڑک حادثے میں کار اور بیوی بچوں کے ساتھ اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔ ہم نے قومی شاہراہوں پر جتنے بھی سڑک حادثے دیکھے ہیں ان میں اکثریت کار حادثوں کی ہوتی ہے۔ سڑک حادثوں کا شکار کاروں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کسی جن یا راکھشش نے پہاڑی چٹان پھینک کر کاروں کو کچل ڈالا ہے۔ کاروباری لوگ اور سرکاری آفیسر تو کار رکھتے ہیں کیونکہ انہیں کار کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن چند بے روزگار خصوصاً نوجوان بھی کار رکھتے ہیں جب کہ ان کا کوئی کاروبار ہے اور نہ یہ کوئی ملازمت کرتے ہیں۔ ان کا کاروبار کیا ہے اس کا پتہ عام لوگوں کو اس وقت چلتا ہے جب ان نوجوانوں کی تصویر نقلی نوٹوں کی گڈیوں اور گانجہ افیم سے بھری ہوئی پاکٹوں کے ساتھ اخبارات میں چھپتی ہے۔

کاریں صرف گھومنے پھرنے کے لئے ہی نہیں جادو تماشا دکھانے کے کام بھی آتی ہیں۔ ہم ایک گریٹ سٹی میں چھوٹے سرکار نامی جادوگر کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ تماشہ ایک شاندار فنکشن ہال میں جاری تھا۔ فنکشن ہال کے ڈائس پر جادوگر حیرت انگیز جادوئی تماشے دکھا کر تماشائیوں کو حیرت زدہ کر رہا تھا۔ جادوگر کا سب سے حیرت انگیز اور آخری تماشہ یہ تھا کہ ڈائس پر ایک چھوٹی سی سرخ رنگ کی کار رکھ دی جاتی ہے۔ کار میں ایک لڑکی بیٹھی مسکرا رہی ہے جادوگر کار پر بارود کا گولہ پھینک دیتا ہے۔ اچانک دھماکہ کی آواز سے فنکشن ہال دہل اُٹھتا ہے۔ کار کے پرخچے اُڑ جاتے ہیں۔ لڑکی غائب کار کے پرزے بکھرے ہوئے چند منٹوں بعد جادوگر کار کے پرزوں پر چادر ڈال دیتا ہے چادر اُوپر اُٹھنے لگتی ہے۔ جادوگر چادر کھینچ لیتا ہے یہ دیکھ کر تماشائیوں کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑتی ہیں کہ سرخ رنگ کی کار اپنی جگہ صحیح سلامت ہے کار میں بیٹھی ہوئی لڑکی تماشائیوں کی جانب دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔

ہندی فلموں میں کاروں کا استعمال اداکاروں سے زیادہ ہونے لگا ہے۔ فلموں میں کاریں خلا میں اُڑنے کے بعد پلٹیاں کھاتی ہوئی سڑک پر محفوظ پہنچ جاتی ہیں۔ ہیرو جب کار میں سوار ہو کر ویلین کی کار کا پیچھا کرتا ہے تو اس کی کار بسوں ٹرکوں اور ٹریفک اژدہام کے اوپر سے اُڑ کر ویلین کی کار کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ وہیکل ٹکنالوجی نے آج اتنی ترقی کرلی ہے کہ اب ایسی کاریں بھی تیار ہونے لگی ہیں جو سڑک پر تو دوڑتی ہی ہیں اُن کے آگے اچانک دریا یا سمندر آ گیا تو پانی پر فراٹے بھرتی ہیں۔ ترقی کی یہی رفتار رہی تو وہ دن دور نہیں کاریں سڑک پر دوڑتی ہوا میں اڑنے لگیں گی اگر ایسا ہو گیا تو وہ دن آٹو موبائیل کمپنیوں کے لیے خوشی کے دن ہوں گے اور ہوائی جہاز اور ہیلی کاپٹر کمپنیوں کیلئے بربادی کے دن۔۔

☆......○......☆

منظور وقار
گلبرگہ
9731428416

داستاں دانتوں کی

دانتوں کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ باوا آدم اور ماں حوا کی۔ ہمارے ان اجداد نے خالق کائنات کے منع کرنے کے باوجود گندم کا دانہ کھانے کی غلطی کی۔ اس نافرمانی کی پاداش میں عرش کی جنت سے نکال کر فرش کی جہنم عرف دُنیا میں پھینک دیئے گئے۔

آدمؑ اور حواؑ نے گندم کا دانہ کھایا مطلب چبا کر کھایا ہوگا۔ گویا اُن کے منہ میں دانت تھے اگر اُن کے منہ میں دانت ہی نہ ہوتے تو گندم کس طرح چباتے سالم گندم ہی نگل جاتے۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید جنت سے ہاتھ نہیں دھو بیٹھتے کیونکہ نگلنے کا عمل کھانے میں شمار نہیں ہوتا۔ خیر آدمؑ اور حواؑ کی کہانی ادھوری چھوڑ کر ہم اصل موضوع کی جانب آتے ہیں۔

انسان کو آرام و آسائش کی کتنی بھی چیزیں میسر کیوں نہ ہوں وہ مطمئن نہیں رہتا۔ ہمیشہ کچھ کر دکھانے اور کچھ بگاڑنے کے چکر میں لگا رہتا ہے۔ جوں جوں دُنیا سائنس اور ٹکنالوجی کی جانب تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے اسی رفتار سے آج کا انسان عہد ماضی کی تاریخی قبروں کو کھودنے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ عہدِ ماضی کی قبروں مقبروں اور کھنڈروں میں جتنے بھی انسانی ڈھانچے ملے ہیں، وہ اتنے بوسیدہ اور شکستہ ہو چکے ہیں کہ اُن کے ہاتھوں اور پاؤں کی ہڈیوں کے بکھرے پرزوں کو جوڑ کر سالم انسانی ڈھانچے میں تبدیل کرنا مورخین اور ریسرچ اسکالروں کے لئے یہ کام سر درد ہی نہیں سر کو تاریخی قبروں کی سیاہ چٹانوں سے ٹکرانے کے برابر ہے۔ البتہ انسانی ڈھانچوں کے ہاتھ پیر محفوظ ہوں نہ ہوں ان کی کھوپڑیوں اور جبڑوں میں ان کے دانت نہ صرف محفوظ ہیں بلکہ پورے جاہ و جلال کے ساتھ دیکھنے والوں کو ڈراتے بھی ہیں کہ یہ وہی دانت ہیں جو جنگ کے دوران دشمنوں کے دانت کھٹے کرتے تھے۔ جنگ کے دوران اگر دشمن بھاری پڑ گیا تو دشمنوں کی گردنیں کاٹنے کی کوشش میں کبھی کبھی خود کی گردنیں کٹوانے کے ساتھ ساتھ دانت سے بھی محروم ہو جاتے تھے۔

دور ماضی میں اگر کوئی نوجوان خاتون چہرے پر گھونگھٹ ڈالے سر جھکائے دانتوں کو منہ میں چھپائے نظر آتی تو اس خاتون کو حسین اور شریف خاتون کہا جاتا تھا۔ آج اگر کوئی خاتون پردے اور گھونگھٹ سے بے نیاز مردوں کے سامنے مسکرا مسکرا کر دانتوں کی نمائش کرتی ہے تو اس خاتون کا شمار خوبصورت خواتین میں ہونے لگتا ہے۔ یہی خاتون اگر سفید دانتوں کے ساتھ ساتھ سفید جسم کی نمائش کرتی ہے تو حسینہ عالم کا خطاب حاصل کر کے راتوں رات عالمی شہرت حاصل کر لیتی ہے۔

ہر قسم کی مٹھائیاں اور پھل دانتوں کے بغیر بے ذائقہ ہیں جب تک مٹھائیاں اور پھل دانتوں سے ہوتے ہوئے شکم میں نہیں پہنچتے اس وقت تک مٹھائیوں کی مٹھاس کا مزہ آتا ہے اور نہ پھلوں کی کھٹاس کا لطف ملتا ہے۔ دانت جہاں 80 برس کے بوڑھے کو جوان بنائے رکھتے ہیں، وہیں 20 برس کا نوجوان دانتوں کے بغیر عمر رسیدہ لوگوں میں شمار ہونے لگتا ہے۔ جو لوگ کسی نہ کسی وجہ سے قدرتی دانتوں سے محروم ہو جاتے ہیں وہ بوڑھے کہلانے کے خوف سے نقلی دانت لگاتے ہیں۔ نقلی دانت کھانے کے لیے نہیں صرف دکھانے کے لئے ہوتے ہیں۔ ان دنوں نقلی چیزوں کا چلن اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اصلی دانتوں پر بھی ہمیں نقلی دانتوں کا گمان ہونے لگا ہے۔ اصلی دانتوں پر ہاتھی کے دانت یعنی دکھانے کے دانت بھاری

ہیں۔اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جس کے دانت مضبوط اور لمبے ہوتے ہیں ان کا دل حاتم طائی کے دل کی طرح بڑا ہوتا ہے۔یہ اور بات ہے کہ حاتم طائی نیکی کر کے دریا میں ڈالتا تھا برخلاف اس کے مضبوط اور لمبے دانت والے نیکی کر کے دریا میں ڈالنے کے بجائے اخبارات اور ٹی وی چینلوں میں ڈالتے ہیں تاکہ ان کی نیکی اور بڑے دل کی تشہیر ساری دُنیا میں ہوتی رہے۔جو لوگ شب و روز دارو (شراب) پینے کے عادی ہوتے ہیں وہ کچھ کھاتے ہی نہیں صرف پیتے ہی رہتے ہیں۔جب یہ لوگ کچھ کھاتے ہی نہیں تو انہیں دانتوں کی چنداں ضرورت نہیں۔شرابیوں کی شراب نوشی میں جوں جوں اضافہ ہونے لگتا ہے ان کے دانت پت جھڑ کے پتوں کی طرح گرنے لگتے ہیں۔پورے دانتوں سے محرومی بھی ان کی شراب نوشی کا بال بھی بانکا نہیں کرسکتی کیونکہ فرق صرف اتنا پڑتا ہے کہ یہ لوگ دانت کی موجودگی میں شراب کا گلاس منہ کو لگاتے تھے۔دانتوں سے محروم ہونے کے بعد پوپلے منہ کو شراب کی سالم بوتل ہی لگا دیتے ہیں۔چند لوگوں کے دانت خود بخود گر جاتے ہیں تو کچھ لوگ دانتوں سے محروم ہونے کے لیے بڑی کدو کاوش کرتے ہیں مثلاً دن رات پان سپاری گٹکھا تمباکو وغیرہ کی جگالی کرتے ہیں۔بعض لوگوں کو ذائقہ دار چیزوں کی جگالی کرنے کا شوق نہیں ہوتا پھر بھی ان کو اپنے دانت اپنی مرضی سے اکھاڑنے پڑتے ہیں۔کیونکہ ان کے دانتوں سے کیڑے دوستی کرلیتے ہیں۔یہ کیڑے انہیں اتنی اذیت دیتے ہیں کہ بے چارہ دانتوں کے درد کا مارا خصوصاً داڑھ کے درد کا مصیبت زدہ گھر ہو یا آنگن، آفیس ہو کہ ہوٹل پھولے ہوئے گال کو سہلاتے ہوئے روتے بسورتے داڑھ کے درد کو کوستا نظر آتا ہے۔انسان فطرتاً کمزور پیدا ہوا ہے۔بھلا کہاں تک دانت درد کو برداشت کر پائے گا۔مجبوراً دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس جا کر دانت نکلوا لیتا ہے۔ادھر ایک دانت اکھڑ گیا کہ اس کا پڑوسی دانت ہاتھ پیر نکال کر ہولے ہولے درد دینے لگتا ہے یہاں تک کہ صاحب دانت کو درد کے دریا میں غرق کر کے اس انتظار میں رہتا ہے کہ اسے بھی جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔یوں ایک کے بعد دیگر ایماندار ملازمین سرکار کی طرح کم ہونے لگتے ہیں۔گنجے انسان بالوں کے بغیر بھی زندگی کی خوشیاں لوٹتے ہیں برخلاف اس کے دانتوں سے محروم انسان زندگی کی خوشیوں کے ساتھ ساتھ پھلوں گوشت اور لذیذ غذاؤں کی لذتوں سے بھی محروم ہوجاتے ہیں۔تقریباً ہر جانور اور چرند پرند کے دانت ہوتے ہیں۔علاوہ ازیں شیر ببر اور بھیڑیوں کے دانت بھی ہوتے ہیں لیکن ان دانتوں کا شمار خونخوار دانتوں میں ہوتا ہے۔کتے اور سانپوں کے دانت کا شمار زہریلے دانتوں میں ہوتا ہے۔کہتے ہیں سانپ کا کاٹا بچ بھی سکتا ہے لیکن انسان کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا۔خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا تھا لیکن انسان اپنی وحشیانہ حرکتوں سے درندوں کو بھی پیچھے ڈال دیتا ہے۔

محاورہ مشہور ہے کہ کھانے کے دانت کچھ اور ہوتے ہیں دکھانے کے دانت کچھ اور ہم اگر اس محاورہ کی سچائی کا بہ نفس نفیس مشاہدہ کرنا چاہیں گے تو ہمیں ہمارے ملک کے چند سیاسی لیڈروں اور نام نہاد قائدین کے حالات زندگی پر نظر ڈالنی پڑے گی۔کسی ریاست کا وزیر اعلیٰ صرف ایک روپیہ ماہانہ تنخواہ لے کر عوام کی خدمت کا دعویٰ کرتا ہے تو کوئی قائد قوم کیلئے خود کو مٹانے اپنی دھن دولت کو قوم وملت پر نچھاور کرنے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن جب ہم اس طرح کے دعوے کرنے والے سیاسی قائدین اور لیڈروں کی دولت اور بینک بیلنس کا جائزہ لیتے ہیں تو ہماری آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑتی ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے قارون کا خزانہ زمین پھاڑ کر ان لوگوں کے پاس پہنچ گیا ہے۔لڑائی جھگڑے جیسے اہم کارنامے انجام دینے کے دوران لوگوں کو اس طرح کی دھمکیاں دیتے ہوئے آپ نے بارہا دیکھا ہوگا۔''اگر ہاتھ بھی لگایا تو دانت توڑ کر ہاتھ میں رکھ دوں گا۔'' ''اب اگر ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو منہ میں ایک بھی دانت باقی نہیں رہے گا۔'' ''دانت سلامت رکھنے ہیں تو مجھ سے مت ٹکرانا۔'' حالانکہ اس طرح کی دھمکیاں دینے والے کسی کے دانت توڑنا تو بڑی بات ہے کسی کا بال بھی بانکا نہیں کرسکتے۔برخلاف اس کے بعض وقت خود اپنے دانت دوسروں کے ہاتھوں تڑوا کر مارے

شرم کے گوشہ گمنامی میں چلے جاتے ہیں۔جو لوگ نقلی دانت لگاتے ہیں وہ دانت پیس کر اپنے غصہ کا اظہار نہیں کر سکتے اگر دانت پیس کر غصہ کا اظہار کرنے کی غلطی کرتے ہیں تو بتیسی ان کے ہاتھوں میں آجاتی ہے۔لہذا یہ لوگ دانت پیس کر بیوی بچوں پر غصہ کا اظہار کرنے کے بجائے آنکھیں پھاڑ کر غصہ کا اظہار کرتے ہیں۔جبکہ دانت پیس کر غصہ کا اظہار کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔نقلی دانت رکھنے والے لوگ تہاری بریانی میں موجود بوٹیاں نوچنے اور ہڈیاں چبانے کی لذت سے محروم ہوتے ہیں۔تاہم لوگ گوشت کے اس قدر دیوانے ہوتے ہیں کہ پوپلے منہ سے بوٹیوں کو یوں نگل کر ہضم کرجاتے ہیں جیسے ہمارے ملک کے چند ایماندار وزراء اور اعلیٰ عہدیدار سرکاری خزانے میں موجود رقم نگل جاتے ہیں۔زمین پر چلتے پھرتے جانوروں حیوانوں اور رینگنے والے سانپوں اور مگر مچھ کے دانت اصلی ہوتے ہیں صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے جو اصلی دانتوں کی محرومی کے بعد نقلی دانت لگاتے ہیں اور نقلی دانتوں کے ساتھ ہی داعی اجل کو لبیک کہتے ہیں۔کفن چور حضرات قبر میں اتر کر کفن کے ساتھ ساتھ نقلی دانتوں کی پوری بتیسی ہی اکھاڑ کر فرار ہوجاتے ہیں۔بعض سیٹھ ساہوکاروں کو سونے کے دانت لگانے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔اُن کے منہ میں دو تین سونے کے دانت یوں چمکتے ہیں جس طرح بعض سیاسی قائدین کی انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں ۔کنگال اور دیوالیہ سیٹھ ساہوکاروں کو سونے کے دانت لگانے کا شوق ہوتا ہے۔وہ سالم سونے کے دانت لگانے کے بجائے دانتوں پر سونے کا پانی چڑھاتے ہیں۔ ہمارے سماج میں ایسے لوگ بھی ہیں جو سونے کے دانت لگا سکتے ہیں اور نہ دانتوں پر سونے کا پانی چڑھانے کی سکت رکھتے ہیں۔تاہم یہ لوگ اپنے دانتوں کو لال پیلا اور مٹیالہ رنگ دینے کے لئے پان تمباکو سپاری پان مصالحہ پان پراگ اسٹار گٹکھا مانک چند اور چمن زردہ جیسی چیزوں کا استعمال کرتے ہیں۔ان چیزوں کے چبانے دن بھر جگالی کرتے رہنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے رنگین دانت جلد ہی گلنے سڑنے لگتے ہیں۔یہاں تک کہ دانت جڑ سے اکھڑ کر صاحب دانت کو بے دانت بنا دیتے ہیں۔ بے دانت اور بے اولاد لوگوں میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا۔بے دانت لوگ پھلوں اور غذاؤں کی لذت سے محروم ہوتے ہیں۔بے اولاد لوگ اولاد کی خوشیوں سے ۔ بے دانت لوگ نقلی دانت لگا کر خوشی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو بے اولاد لوگ دوسروں کی اولاد کو گود لے کر خوش ہوتے ہیں۔

بعض معزز حضرات خصوصاً سیاسی قائدین اور اعلیٰ افسروں کے دانت سرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔قیمتی توتھ پاوڈر،ٹوتھ پیسٹ لگا کر دن رات برش کرنے کے باوجود ان کے دانت سرخ کے سرخ ہی رہتے ہیں۔دانتوں کی سرخی میں رتی بھر فرق نہیں آتا۔اس کی وجہ جاننے کی کوشش کی گئی تو پتہ چلا یہ لوگ مجبور اور بھولے بھالے انسانوں کا خون رشوت کی شکل میں ایسا ڈٹ کر پیتے ہیں کہ ان کے دانتوں پہ چڑھی خون کی سرخی چھوٹنے کا نام نہیں لیتی۔کارپوریٹ کمپنیوں ،فائیو اسٹار ہوٹلوں،ہائی ٹیک شاپنگ اور مالس میں کام کرنے والی خوبصورت نوخیز لڑکیوں کے دانت بھی خوبصورت اور سفید بھک ہوتے ہیں۔ان لڑکیوں کو نہ صرف اپنے دانتوں کو سفید رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ گاہکوں کے سامنے مسکرا مسکرا کر دانتوں کی نمائش بھی کرنی ہوتی ہے۔کیونکہ ان کمپنیوں کے کاروبار اور لڑکیوں کی ملازمت کا دارو مدار ہی ان سیلس گرلس کے سفید اور چمکدار دانتوں پر ہوتا ہے۔ڈراموں ،ناٹکوں اور فلموں میں اداکاری کرنے والی لڑکیوں خصوصاً فلمی ہیروین کی کامیابی کا انحصار ان کی اداکاری سے زیادہ ان کے سفید اور چمکدار دانتوں پر ہوتا ہے۔جو فلم اداکارہ زیادہ سے زیادہ مسکرا کر اپنے سفید اور خوبصورت دانتوں کی نمائش کرتی ہے وہ شائقین فلم کے ساتھ ساتھ فلم ڈائریکٹر کو دیوانہ بنانے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔فلم ڈائریکٹر تو اس قدر دیوانے ہوجاتے ہیں کہ پانچ بچوں اور بے ڈول جسم بیوی کو گمنامی کے اندھیرے میں ڈھکیل کر اپنے سے آدھی عمر کی ہیروئین سے شادی کرلیتے ہیں ۔ اگر لوگوں کے منہ میں دانت ہی نہ ہوں تو ہمارے ملک کے 80% ٹی۔وی چینلس بند ہوجائیں گے۔کیونکہ ان

پرائیوٹ چینلوں کی زندگی کا دارومدار ہی ٹوتھ پوڈر ٹوتھ پیسٹ اور ٹوتھ برش کے اشتہارات پر ہے۔جب لوگوں کے منہ میں دانت ہی نہ ہوں گے تو ان سے متعلق اشتہارات میں بھلا کون دلچسپی لے گا۔ ائیر ہوسٹس کی ملازمت کا انحصار بھی اس کے سفید اور خوبصورت دانتوں پر ہوتا ہے۔مسافر ائیر ہوسٹس کی مسکراہٹ کا مزہ لینے کے لئے اس سے کچھ نہ کچھ طلب کرتے ہیں ۔ حالانکہ انہیں کافی کی طلب ہوتی ہے اور نہ ہی ناشتہ کی ضرورت۔

مشاعروں میں جن شعراً کو ترنم اور اداکاری کے ساتھ غزل سنانے کا گر نہیں آتا ،وہ ڈائس پر پہنچتے ہی دانت باہر نکال کر سامعین کی جانب دیکھنے لگتے ہیں۔سامعین شاعر کی اس ادا پر ایسا لٹو ہوجاتے ہیں کہ اس کا کلام سماعت کرنے سے قبل ہی قہقہے لگا کر داد دینے لگتے ہیں۔دانتوں کے بغیر غزل سنا کر سامعین سے داد حاصل کرنا دانتوں تلے پسینہ لانے کے برابر ہے۔جن شعراً کے منہ میں دانت نہیں ہوتے وہ پوپلے منہ سے غزل کا ایک ایک شعر یوں ادا کرتے ہیں لگتا ہے حالت نزع میں بیوی بچوں اور قرض داروں سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔اُردو شاعری میں جہاں محبوبہ کے رُخساروں زلفوں،آنکھوں اور اداؤں کا ذکر ملتا ہے وہیں دانتوں کا ذکر دور دور تک نہیں ملتا حالانکہ خوبصورت خواتین کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے میں جو اہم رول دانت ادا کرتے ہیں، یہ کام میک اپ کا سامان بھی انجام نہیں دے سکتا۔ چندلوگوں کو اپنی تیز وطرار اور کٹیلی باتوں سے اپنے مخاطب کے دانت کھٹے کرنے کا فن خوب آتا ہے۔ اکثر بیویاں دن میں دس بار اپنی کڑوی باتوں سے شوہروں کے دانت کھٹے کرتی رہتی ہیں۔شوہر حضرات کھٹے دانتوں کی کھٹاس کو کم کرنے کیلئے پان تمبا کو اور گٹکھا استعمال کرتے ہیں۔رشوت کھانے اور سرکاری مال ہضم کرنے کے لئے دانتوں اور معدے کی ضرورت نہیں ہوتی اس کے لئے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔جن ملازمین سرکار کے دانت چھوٹے اور دماغ بڑا ہوتا ہے وہ رشوت کھانے میں ماہر ہوتے ہیں۔موقع ملا تو سرکاری خزانہ ہی خالی کردیتے ہیں۔ہم حضرت انسان شیر ببر کے دانت مگر مچھ اور بھیڑیے کے دانت شیطان اور چڑیل کے دانتوں کے علاوہ سانپ اور چوہے کے دانتوں سے بخوبی واقف ہیں لیکن دودھ کے دانت کا دیدار آج تک نہیں کرسکے جب کہ اکثر لوگ بول چال کے دوران اس طرح کے ڈائیلاگ ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔’’دودھ کے دانت بھی نہیں نکلے لگا لڑکیوں کو لائن مارنے‘‘،’’ دودھ کے دانت بھی نہیں گرے ضد کررہا ہے شادی کی‘‘ ’’ دودھ کے دانت بھی نہیں گئے نصیحت کررہا ہے بزرگوں کو‘‘ ہم ڈائری فارم کے دودھ کو ہی دودھ سمجھتے ہیں۔ڈائری فارم کے دودھ کے دانت نہیں ہوتے صرف پلاسٹک کے پاکٹ ہوتے ہیں۔ایک دن ہم نے ہمارے دانشور دوست علامہ کاروبار سے دریافت کیا علامہ دودھ کے دانت کسے کہتے ہیں ان کا دیدار کس طرح ہوسکتا ہے؟ ہمارا سوال سن کر علامہ پہلے تو ہنس پڑے پھر طنز کا تھپڑ ہمارے تھوبڑے پر مارتے ہوئے بولے۔’’وقار! تمہارے سر اور داڑھی کا ایک ایک بال سفید ہو چکا ہے۔اس عمر کو پہنچ کر بھی تمہیں اس بات کا پتہ نہیں دودھ کے دانت کسے کہتے ہیں۔ایسا لگتا ہے ابھی تک تمہارے دودھ کے دانت گرے ہی نہیں ۔تم جیسے بیوقوف کو کچھ سمجھانا عبث ہے۔‘‘ اتنا کہہ کر علامہ نو دو گیارہ ہوگئے۔علامہ چالاک ہی نہیں بڑے پہنچے ہوئے چالاک انسان ہیں۔ بڑی چالاکی سے ہمارا سوال ٹال گئے اور ہم کھسیانی بلی کی طرح اپنے دانت دکھاتے رہ گئے۔

☆......○......☆

نامورمزاح نگار یوسف ناظم
کا دلچسپ سفرنامہ
امریکہ میری عینک سے
قیمت: ۶۰ روپے
بتوسط: شگوفہ حاصل کیجئے

منظور وقار
گلبرگہ
9731428416

سامعین

سامعین سماعت کرنے والوں کو کہا جاتا ہے لیکن ہر طرح کی باتیں سماعت کرنے والے لوگ سامعین نہیں کہلاتے ۔ جو لوگ پڑوسیوں کی خفیہ باتیں اور دوستوں کی برائیاں سماعت کرتے ہیں انہیں سامعین نہیں سازشین عرف چغل خور کہا جاتا ہے ۔البتہ سیاسی جلسوں ،مشاعروں ادبی اجلاسوں ،نورانی محفلوں اور محفل سماع میں شریک ہونے والے سامعین کہلاتے ہیں۔مختلف مقاصد کے لیے طرح طرح کی محفلوں جلسوں اور ادبی اجلاسوں کا انعقاد عمل میں آتا ہے۔لہذا ہر محفل کے سامعین کا مزاج اور مذاق الگ الگ ہوتا ہے۔ہم یہاں سامعین کی چند قسموں پر وہ ڈال رہے ہیں جس کو روشنی کہا جاتا ہے۔

سیاسی جلسوں کے سامعین

سیاسی جلسوں کے سامعین کا حلقہ کافی وسیع ہوتا ہے ۔ یہ لوگ صرف سیاسی جلسوں اور انتخابی ریلیوں میں شرکت کرتے ہیں۔ انہیں مشاعروں ،ادبی اجلاسوں اور وعظ و بیان سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ۔انہیں صرف سیاسی قائدین ، برسر اقتدار وزرا ،اراکین اسمبلی،اور اراکین پارلیمان سے نہ صرف دلچسپی ہوتی ہے گہری عقیدت بھی ۔لہذا جب بھی شہر میں کوئی سیاسی جلسہ یا انتخابی ریلی ہوتی ہے یہ لوگ بڑے ذوق و شوق سے شرکت کرتے ہیں ۔کوشش کرتے ہیں کہ ڈائس کے قریب بیٹھ جائیں ۔دوران تقریر یہ لوگ لیڈروں کے جھوٹے وعدوں ، لچھے دار باتوں، جوشیلی تقریروں کو سن کر متاثر ہوتے ہیں۔جذبات میں آ کر فلاں پارٹی زندہ باد فلاں لیڈر زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں۔تالیاں پیٹتے ہیں بہت زیادہ جوش میں آ گئے تو سیٹیاں بجاتے ہیں ۔سیاسی جلسوں اور انتخابی ریلیوں میں شرکت کرنے والے سامعین کو بیٹھنے کے لئے کرسیوں اور چٹائیوں وغیرہ کے اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی ۔اگر کرسیاں رکھی گئی ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ یہ لوگ فرش یا سبزہ زار پر بیٹھ کر ہی جلسہ سماعت کرتے ہیں ۔قائدین ولولہ انگیز تقریروں اور لیڈروں کی لچھے دار باتوں سے لطف بھی اُٹھاتے ہیں ۔اگر انہیں فرش اور سبزہ زار پر بیٹھنے کے لیے جگہ میسر نہ بھی آئے تو کوئی بات نہیں یہ لوگ جلسہ گاہ کے دائیں بائیں یا جلسہ گاہ کے باہر کھڑے ہو کر تقریریں سماعت کرتے ہیں ۔چند سامعین کو تو ہم نے درختوں کی شاخوں اور مکانات کی چھتوں پر کھڑے ہو کر لیڈروں اور قائدین کی تقریروں سے محظوظ ہوتے ہوئے دیکھا ہے ۔(کبھی کبھی مکانات کی چھتوں پر بیٹھ کر لیڈروں کی تقریں سماعت کرنے کے دوران چھتیں بیٹھ جانے کے باعث بھگوان کو پیارے ہو جاتے ہیں) سیاسی جلسوں اور ریلیوں میں سامعین کی بھیڑ جٹانے کے لیے لوگوں کو شہر کے اطراف و اکناف کے دیہاتوں سے لاریوں ،بس اور ٹریکٹروں میں بھر کر لایا جاتا ہے ۔لوگوں کی بھیڑ جمع کرنے کے لیے لائے گئے ہر سامع کو ایک دن کی مزدوری کی رقم دینے کے ساتھ ساتھ ان کے طعام کا انتظام بھی کیا جاتا ہے ۔(صرف طعام کا قیام کا نہیں) جلسے یا انتخابی ریلی میں شریک سامعین جلسے کے اختتام کے بعد اگر اپنے گاؤں واپس نہیں لوٹتے ہیں تو اس صورت میں یہ لوگ جلسہ گاہ کے کھلے میدان میں ہی پیر پھیلا کر سو جاتے ہیں ۔انتخابی ریلیوں میں شرکت کرنے والے سامعین منہ بند رکھ کر تقاریر سماعت نہیں کرتے بلکہ چنے پھانکتے ہوئے مونگ پھلی کھاتے ہوئے

ہسگریٹ بیڑی کے کش لگاتے ہوئے ، پان گٹکا اور تمباکو کی جگالی کرکے پیک دائیں بائیں اگلتے ہوئے تقاریر سماعت کرتے ہیں۔بعض سامعین کے ہاتھوں میں آئس کریم مرچی بھجیئے اور پاپڑ بھی ہوتے ہیں۔ سیاسی جلسوں اور انتخابی ریلیوں میں شرکت کرنے والے سامعین بڑے سیکولرقسم کے ہوتے ہیں۔انہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ جلسہ کس سیاسی جماعت کی جانب سے منعقد کیا گیا ہے۔انہیں تو پرجوش اور جذباتی تقریریں جھاڑنے والے لیڈروں اور قائدین کے پرکشش وعدوں کو سماعت کرنا ہوتا ہے۔جہاں تک ووٹ ڈالنے کا تعلق ہے یہ لوگ کس پارٹی اور کس امیدوار کے حق میں ووٹ ڈالنے والے ہیں یہ راز صرف سامعین کے دلوں میں محفوظ ہوتا ہے۔بچارے لیڈر اور قائدین اس غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ جلسہ گاہ میں سامعین کی جو بھیڑ جمع ہے یہ تمام لوگ ان کی جماعت اور اُن کے اُمیدواروں کے حق میں ووٹ ڈالنے والے ہیں۔

مشاعروں کے سامعین

مشاعروں میں شرکت کرنے والے سامعین شاعری سے زیادہ شاعروں میں دلچسپی لیتے ہیں۔انہیں شاعر کا کلام سماعت کرکے اتنا لطف نہیں جتنا لطف شاعر کی حرکات وسکنات ،جھٹکوں اور کمر کی لچک کو دیکھ کر آتا ہے۔چنانچہ شاعر جوں ہی کلام سنانے کے لیے مائیک سنبھالتا ہے۔سامعین کی صفوں میں تھوڑی ہلچل سی پیدا ہوتی ہے۔وہ شاعر کے سراپے پر نظر ڈالتے ہیں۔شاعر اگر سنجیدہ پروقار شخصیت کا مالک ہے تو اس صورت میں سامعین بھی سنجیدہ کسی قدر رنجیدہ ہوجاتے ہیں۔کیونکہ سامعین کو سنجیدہ مزاج شاعر میں ان کی دلچسپی کا کوئی سامان نظر نہیں آتا۔سنجیدہ مزاج شاعر اکثر سنجیدہ کلام سناتے ہیں۔سنجیدہ اور معیاری کلام سنانے والے شعرا کو پہلی صف میں بیٹھے ہوئے معزز سامعین ہی تھوڑی بہت داد دیتے ہیں۔سامعین کی پچھلی صفوں میں سناٹا رہتا ہے۔بعض وقت پچھلی صفوں سے اس طرح کے جملے بھی ابھرتے ہیں۔بس کر بس کر، بیٹھ جا بیٹھ جا۔ہاں اگر کوئی شاعر بے ترتیب لباس بکھرے بال دانت باہر نکلے ہوئے مضحکہ خیز سراپے کے ساتھ ڈائس پر پہنچ کر غزل سنانے سے پہلے سامعین کی جانب دانت نکال کر چہرہ بگاڑ کر دیکھتا ہے تو سمجھئے سامعین کی دلچسپی کا سامان مل گیا۔شاعر کی غزل ہو کہ ہزل ہر شعر پر سامعین ہنس ہنس کر داد دیں گے۔ٹڈوں کی طرح اچھلنے لگیں گے۔مشاعروں کے سامعین کی نظر شاعر کی ہر حرکت پر ہوتی ہے۔مثلاً شاعر کا ناک کو ہاتھ لگانا ،ٹائی درست کرنا، آنکھوں پر لگے چشمے کو آگے پیچھے کرنا۔غرض شاعر کی ہر حرکت سامعین کی دلچسپی کا باعث ہوا کرتی ہے۔اگر کوئی خوبصورت چہرہ (میک اپ میں لت پت) شاعرہ پرکشش لباس میں ملبوس ڈائس پر تشریف فرما ہوتی ہے تو سامعین کی تمام تر توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔شاعرہ کلام سنانے کے لیے جوں ہی مائیک سنبھالتی ہے، سامعین خوبصورت شاعرہ کے قیامت خیز سراپے میں کھو جاتے ہیں۔انہیں پتہ ہی نہیں چلتا شاعرہ نے اپنی رس بھری آواز اور مدہوش کرنے والے ترنم میں کونسی غزل سنائی ۔سامعین کو تو ہوش اُس وقت آتا ہے جب شاعرہ غزل گائیکی کا مظاہرہ کرنے کے بعد اپنی نشست پر تشریف فرما ہوجاتی ہے۔مشاعروں کے سامعین کی اکثریت استاد شعرا کے شاگردوں دوست و احباب اور رشتہ داروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ہمارے شہر کے عالمی شہرت یافتہ شاعر ادیب ومزاح نگار علامہ کاروباری گلی کوچوں کے مشاعروں اور شعری نشستوں کو منہ نہیں لگاتے صرف کل ہند مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں۔اُن کی دلچسپی مشاعروں میں حاصل ہونے والی داد سے زیادہ مشاعروں کے بعد شعرا کی خدمت میں پیش کی جانے والی رقم کی پاکٹ میں ہوتی ہے۔علامہ مشاعرہ میں شرکت سے پہلے اپنے ساتھ تیس چالیس سامعین ضرور لے آتے ہیں۔ یہ سامعین دوران مشاعرہ ''علامہ کاروباری وانٹیڈ'' ''علامہ کاروباری زندہ باد'' کے نعرے لگاتے ہیں۔علامہ جوں ہی غزل سنانے کے لیے مائیک کے سامنے کھڑے ہوجاتے ہیں۔یہ سامعین اُچھل اُچھل کر واہ واہ مکرر مکرر کی آوازیں نکال کر مشاعرہ گاہ کو مچھلی مارکیٹ

میں بدل دیتے ہیں۔علامہ کے نام اور کلام کی مقبولیت اور مانگ کو دیکھ کر ڈائس پر تشریف فرما دیگر شعراً رشک اور حسد کی آگ میں اندر اندر ہی جلتے ہوئے ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگتے ہیں۔

ادبی اجلاسوں کے سامعین

ادبی اجلاسوں کے سامعین سراپا سنجیدہ مزاج ہوتے ہیں۔ شکل وصورت سے سامعین کم ، دانشور زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سے چند سامعین کو پان کی جگالی کرنے کی عادت ہوتی ہے تو بعض کو ہر پانچ دس منٹ بعد سگریٹ پھونکنے کی عادت۔ ادبی اجلاسوں کے سامعین مقررہ وقت پر ادبی اجلاس میں شرکت کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔اگر ادبی اجلاس صبح 11-00 بجے شروع ہونے والا ہے تو یہ لوگ بہترین لباس زیب تن کر کے پالش کیے ہوئے چمکدار بوٹ، چہرے پر پاوڈر بالوں میں خضاب لگا کر ٹہلتے ہوئے یا بائیک پر 12-00 بجے فنکشن ہال کے قریب پہنچ کر ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں گے۔کوئی ان کا استقبال کرنے والا ہے یا نہیں ۔ جب کوئی نوجوان آگے بڑھ کر انہیں خوش آمدید کہے گا تو یہ لوگ فنکشن ہال میں اس شان بے نیازی کے ساتھ قدم رنجہ فرمائیں گے گویا وہ قلمکاروں اور منتظمین اجلاس پر احسان کررہے ہیں۔ادبی اجلاسوں میں شرکت کرنے والے سامعین تعلیم یافتہ ہی نہیں نیم ادیب خطرہ ادب ہوتے ہیں۔ادبی اجلاسوں میں سنائے گئے افسانے اور مقالے اُن کی پسند اور معیار پر اترتے ہوں تو مشکل سے اُن کے منہ سے ایک ہلکی سی واہ نکلتی ہے ورنہ ایسا گم صم بیٹھے رہیں گے گویا محفل میں سانپ سونگھ گیا ہے۔ادبی اجلاسوں میں شرکت کرنے والے سامعین کی تعداد اُنگلیوں پر گنی جاتی ہے۔جس ادبی اجلاس میں پچیس تیس سامعین شریک رہیں گے اُسے کامیاب ادبی اجلاس کہا جاتا ہے۔ منتظمین اجلاس بڑے فخر سے اخبارات میں رپورٹ شائع کرائیں گے کہ اجلاس میں باذوق سامعین کی کثیر تعداد موجود تھی۔فنکشن ہال اپنی کم دامنی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔۔

محفل وعظ و بیان کے سامعین

وعظ و بیان کی محفلیں عموماً رات کے وقت منعقد کی جاتی ہیں۔انہیں نورانی محفلیں بھی کہا جاتا ہے۔ان محفلوں میں سامعین پاک وصاف سفید بھک کپڑے زیب تن کر کے آنکھوں میں سرمہ کانوں میں عطر کا پھایا لگا کر بڑے ہی ادب و احترام کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔وعظ و بیان کی محفلوں میں کس واعظ یا عالم دین کو مدعو کیا گیا ہے۔اس کا بذریعہ اشتہارات اور لاوڈاسپیکر جلسے سے دو روز قبل ہی اعلان کیا جاتا ہے۔لہذا جو واعظ یا عالم دین شعلہ بیانی اور جذباتی وعظ و بیان کے لیے جتنا مشہور ہوگا۔اتنی ہی بڑی تعداد میں سامعین کی بھیڑ جلسہ گاہ میں جمع ہوگی اگر کوئی واعظ اپنے بیان میں مسلمانوں کی عام کمزوریوں اور برائیوں کا تذکرہ کرتا ہے۔یا غیرضروری رسومات جھوٹی شان اور فضول خرچی پر تنقید کرتا ہے تو سامعین میں ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ سامعین ایک دوسرے کا چہرہ تکنے کے بعد اس طرح کی سرگوشیاں کرنے لگتے ہیں۔'' ارے مولانا کو کیا ہوگیا مولانا راستہ بھٹک گئے'' ''ہاں بھائی مولانا کو عقائد اور مسلک پر بولنا تھا لگے مسلمانوں کی برائیاں بیان کرنے''۔ واعظ سامعین کی بے چینی کا اندازہ لگا کر فوراً اصل موضوع پر آجاتے ہیں۔مولانا عقائد ، مسلک اور جماعت کی اہمیت پر زور دے کر جوں ہی چند جذباتی جملے ادا کرتے ہیں ادھر سامعین نعرہ تکبیر اللہ اکبر لگاتے ہوئے ڈائس پر پہنچتے ہیں اور ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر مولانا زندہ باد اہل مسلک زندہ باد کے نعرے لگا کر محفل وعظ و بیان کو گرما دیتے ہیں۔۔☆

Address :
MANZOOR VIQAR
Yadullah Colony,
GULBARGA - 585 104
(Karnataka State)

☆......○......☆

خاکہ

منظور وقار
گلبرگہ
9731428416

چلتی پھرتی یونیورسٹی : پروفیسر عبدالحمید اکبر

چھوٹی سی چمکدار داڑھی ، چھوٹا قد ، گول مٹول مسکراتا چہرہ ، مزاج میں نرمی اور مٹھاس ۔طبیعت میں ضبط و تحمل ،خوش گفتار ،خوش مزاج ،حلیم الطبع ، ذی فہم ، ذی شعور، رونق محفل ، رونق بزم ، لباس اور رکھ رکھاو میں ٹھاٹ باٹ تو نہیں خاص خاص موقعوں پر سوٹ بوٹ میں نظر آتے ہیں ۔۔

آنکھوں پر نمبر کا چشمہ، چشمے کے دونوں جانب لٹکتی ہوئی مخملی ڈوریاں ، سیاسی قائدین کی طرح موقع محل دیکھ کر چولا نہیں بدلتے اور محفل کی مناسبت سے لباس زیب تن کرتے ہیں ۔سر کے چمکتے ہوئے چاند کو چند ریشمی ملائم بالوں نے یوں چھپا رکھا ہے جس طرح برقعے کی جالی شوخ حسینہ کے قیامت خیز چہرے کو چھپا لیتی ہے۔

قارئین کرام ! یہ ناک نقشہ مزاج اور سراپا کسی کھاتے پیتے گھر کے خالی گھڑے کا نہیں ہمہ جہت و ہمہ رنگ خوبیوں اور صلاحیتوں سے لبریز ایک چلتی پھرتی منی یونیورسٹی ، پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمید اکبر صاحب کا ہے۔جوں جوں ہم عمر رسیدہ ہوتے جارہے ہیں ہماری یادداشت آوارہ بادلوں کی طرح بھٹک رہی ہے۔کوئی چیز یاد ہی نہیں رہتی مکان سے نکلتے ہیں مچھلی خریدنے مکان لوٹتے ہیں تو ہاتھ میں مٹن ہوتا ہے، اکبر صاحب کو ہم پچھلے چالیس برسوں سے جانتے ہیں ، چالیس سالہ یادوں کے آوارہ بادلوں کو یکجا کرکے اکبر صاحب کا خاکہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

جس زمانے میں اکبر صاحب عمر میں ہم سے چھوٹے تھے اس وقت ہم عمر میں ان سے تھوڑے بڑے تھے (صرف عمر کے حساب سے بڑے،عقل میں تو اکبر صاحب ہم سے اُس دور میں بھی بڑے تھے آج بھی بڑے ہیں)ہم شاید پندرہ سال کے ہوں گے اکبر صاحب دس بارہ سال کے ۔ایک دن ہم نے محلّہ خونی الاوہ میں منعقدہ ایک نعتیہ محفل میں معصوم نعت خواں اکبر کو مترنم آواز میں جھوم جھوم کر نعت سناتے ہوئے دیکھا تو اسی دن سے ہم اس معصوم کے گرویدہ ہوگئے ۔نعت سنانے کا انداز اور رس بھری آواز۔اس دن کے بعد ہم نے شہر کے تقریباً ہر جلسہ اور محفل وعظ و بیان میں چھوٹے نعت خواں اکبر کو نعتیں سناتے داد کی دولت لوٹتے ہوئے دیکھا ۔گردش ایام کا پہیہ آگے بڑھتا رہا۔اکبر صاحب نوجوان اور ہم بھر پور جوان کہلانے لگے اور تو اور ہم دونوں کا شمار بی۔اے پاس بے روزگاروں میں ہونے لگا۔ایک دن ہم بینک میں ملازمت حاصل کرنے کے لیے اسٹیٹ بینک کی جانب سے منعقدہ تحریری امتحان میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ہم نے دیکھا ہمارے سامنے کی ٹیبل پر اکبر صاحب براجمان ہیں ۔اکبر صاحب امتحان ہال ہی میں نہیں ہر معاملے میں ہم سے آگے تھے لہٰذا اس امتحان میں اکبر صاحب کامیاب ہوگئے اور ہم ناکام ۔ امتحان پاس ہوتے ہی اکبر صاحب کو اسٹیٹ بینک آف حیدرآباد میں پکی ملازمت مل گئی اور ہم بینک کی جانب سے منعقدہ امتحان میں ناکام ہوکر یہ سوچتے رہ گئے کاش ہم امتحان ہال میں اکبر صاحب کے جوابی پرچوں کی نقل کرتے تو شاید ہم بھی اسٹیٹ بینک میں کلرک کی کرسی پر جم جاتے ۔ پھر یہ سوچ کر شرمندہ ہوئے کہ نقل کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمارے پاس ندارد ہے۔اس واقعہ کے چند برس بعد اکبر صاحب کو ہم نے

عرس حضرت لنگوٹ بندؒ کے موقع پر منعقدہ جلسہ عظمت اولیاء میں رقت انگیز مترنم آواز میں نعت شریف کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے دیکھا۔نعت شریف کے بول تھے ''آئینہ کے آنگن میں''نعت شریف کے اشعار اور اکبر صاحب کا دل میں اتر جانے والا ترنم اس قدر اثر انگیز تھا کہ ہماری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔اس کے بعد تو اکبر صاحب کی نعت گوئی اوج پر ان کی شہرت موج در موج بڑھتی رہی۔ ہر دینی مذہبی اور ادبی محفل میں اکبر صاحب کی نعت گوئی ضروری قرار دی جانے لگی۔نعت گوئی اور مقابلہ قرأت کلام پاک میں اکبر صاحب کو قومی وبین الاقوامی ایوارڈ اور اعزازت ملنے لگے۔ادھر ہماری بے روزگاری بڑھنے لگی بے روزگار آدمی مرتا کیا نہ کرتا ہم لکھنے لکھانے کی طرف مائل ہوگئے۔ اسکول کے زمانے سے ہی ہم لکھنے لکھانے کی طرف مائل ہی نہیں کرشن چندر منٹو اور بیدی کے افسانوں کے گھائل تھے اس سے قبل کہ ہماری بے روزگاری مستقل کاہلی میں بدل جاتی ہماری کاہلی سے تنگ آ کر یا ہمارے گھر والوں پر رحم کھا کر حکومت کرناٹک نے ہمیں محکمہ مالگزاری میں ریونیو انسپکٹر کی ملازمت فراہم کی اور ہمیں شہر گلبرگہ کی گلیوں سے اٹھا کر بیجاپور ضلع کے دیہاتوں میں دھکیل دیا اور پھر شہر گلبرگہ اور اکبر صاحب سے ہمارا رابطہ پورے پچیس برس تک کٹا رہا لیکن دوران ملازمت جب بھی ہم گلبرگہ آتے اردو اخبارات کے اشتہارات اور شہر کی دیواروں پر چسپاں پوسٹرس سے پتہ چلتا کہ اکبر صاحب کی نعت خوانی عروج پر ہے تو ان کی تقریریں بام عروج پر۔ہمیں اس بات کا بھی علم ہوا کہ اکبر صاحب نے بینک ملازمت کو طلاق دے کر گلبرگہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو فارسی عربی کے آنگن میں پروفیسر کی کرسی سے عقد ثانی کرلیا ہے۔شاید اکبر صاحب کو سمندر میں تیرنے کی خواہش تھی وہ کنویں (بینک کی چار دیواری) میں کس طرح سکون کی سانس لیتے۔

ڈسمبر 2013ء میں ہم محکمہ مالگزاری عرف جھوٹ اور رشوت ستانی کے جہنم سے چھٹکارہ پا کر ہمیشہ کے لیے گلبرگہ لوٹ آئے تو ہماری ملاقاتیں اکبر صاحب سے بڑھنے لگیں۔اکبر صاحب سے کبھی کسی محفل نعت میں ملاقات ہوتی تو کبھی کسی وعظ وبیان کی محفل یا کسی سیمینار میں ۔ اکبر صاحب جس محفل میں شرکت کرتے ہیں اس محفل کے آداب کے لحاظ سے لباس زیب تن کر کے آتے ہیں۔اکبر صاحب کو اگر محفل نعت میں شرکت کرنا ہے یا محفل وعظ وبیان میں تو وہ شیروانی یا سفید بھک کپڑوں میں ملبوس ہوں گے۔آنکھوں میں سرمہ کانوں میں عطر ہوگا سر پر لمبے قد کی سیاہ رنگ کی ٹوپی۔ اگر اکبر صاحب کسی ادبی اجلاس یا سیمینار میں شرکت کرتے ہیں تو سفاری یا سوٹ بوٹ میں ہوں گے ایک ادبی اجلاس کے دوران ہم نے اکبر صاحب سے استفسار کیا۔اکبر صاحب ادبی اجلاس یا سیمینار میں سوٹ بوٹ کے ساتھ شرکت کرنا کیا ضروری ہے۔اکبر صاحب بولے وقار ادبی اجلاس اور سیمیناروں میں سوٹ بوٹ کے ساتھ شرکت کرنا یونیورسٹی پروفیسروں کا شوق نہیں مجبوری ہے۔اگر ہم لوگ سادہ لباس میں آئیں گے تو سامعین ہمیں پروفیسر نہیں کرافٹ ٹیچر سمجھنے لگیں گے۔

اکبر صاحب کو شاید کسی نے مذاق مذاق میں یہ کہہ دیا تھا کہ ہم قلمکار ہیں طنز ومزاح کے میدان میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اکبر صاحب نے مذاق کو حقیقت سمجھ کر دیگر دو مزاح نگاروں کے ساتھ ہمیں بھی بہ حیثیت مزاح نگار گلبرگہ یونیورسٹی کے طلباء کے سامنے انشائیے سنانے کے لیے مدعو کیا اور ہمیں احساس دلایا کہ ہماری تخلیقات اب اس قابل ہوگئی ہیں کہ یونیورسٹی طلباء و طالبات اور ریسرچ اسکالروں کے سامنے پیش کی جاسکتی ہیں۔

اکبر صاحب کا مطالعہ اتنا گہرا اور وسیع ہے کہ سیرت رسول ﷺ پر گھنٹوں تقریر کرسکتے ہیں۔خلفائے راشدین اور انبیائے کرام کے بے شمار واقعات سنا سکتے ہے، اولیاء کرام کے کرامات اور تبلیغ دین پر مفصل بیان دے سکتے ہیں درس قرآن بھی دے سکتے ہیں احادیث کی تفسیر بھی بیان کرسکتے ہیں۔ادبی میدان میں اپنی صلاحیت کا لوہا منوانے کے لیے جدید افسانوں پر بھی بول

سکتے ہیں ، تجریدی افسانوں کا تجزیہ بھی کر سکتے ہیں ۔ شعری میدان میں اتر گئے تو اردو اشعار کی تقطیع کر کے بے وزن شاعری کرنے والے شعرا کو تختہ دار پر چڑھا سکتے ہیں ۔ سیمناروں میں مقالہ پڑھتے ہیں تو ایسا جم کر پڑھتے ہیں لگتا ہے تقریر کر رہے ہیں ۔تقریر کرتے ہیں تو ایسی مربوط تقریر کرتے ہیں کہ لگتا ہے مقالہ پڑھ رہے ہیں ۔ ہر دو صورتوں میں موضوع کا حق ادا کرنا کوئی اکبر صاحب سے سیکھے اگر موقع ملا تو ان سے ٹیوشن بھی لے لیں ۔ڈھیلی ڈھالی تقریریں کرنا یا ڈھیلے ڈھالے مقالے قلمبند کرنا اکبر صاحب کو گوارا نہیں ۔ ایک باوثوق ذریعے سے پتہ چلا ان کے مقالوں کی تعداد دو سو کے قریب ہے ۔ جہاں تک گلبرگہ یونیورسٹی میں خدمات انجام دینے کا معاملہ ہے چاہے پروفیسر کے عہدے پر ہوں یا صدر شعبہ اردو فارسی عربی کے عہدہ پر طلبا وطالبات کو شعبہ سے جوڑے رکھا ،طلبا کے اندر نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ علمی اور ادبی شعور کو جگایا ۔ یونیورسٹی میں ملک کے ممتاز دانشوروں سے مقالے پڑھوائے تقریریں کروائیں ۔ مہمانان اور سامعین کو صرف چائے پانی پر ٹرخانے کے بجائے طعام کا انتظام بھی کرتے رہے ۔ یونیورسٹی کے طلباء طالبات سے مختلف موضوعات پر مقالے لکھوائے ان میں ڈائس پر کھڑے ہوکر مقالے سنانے کا حوصلہ بڑھایا ۔ اکبر صاحب نے طلبا کے علاوہ اپنے ساتھی اساتذہ کے ساتھ بھی خوشگوار تعلقات قائم رکھے ۔ جہاں تک اکبر صاحب کی مصروفیات کا معاملہ ہے ، مغل اعظم عرف اکبر اعظم اکھنڈ بھارت کا شہنشاہ ہوکر بھی اتنا مصروف نہ ہوگا جتنا اکبر صاحب مصروف رہا کرتے ہیں ۔ اکبر اعظم کو اور کام بھی کیا تھا گلاب کا پھول سونگھنا ، انار کلی کا رقص دیکھنا ، جودھا بائی کی فرمائش پوری کرنا ہاتھیوں اور گھوڑوں کے نام یاد رکھنا جبکہ اکبر صاحب صبح کسی سیمینار میں شرکت کرتے ہیں تو دوپہر کسی دعوت میں شریک ہوتے ہیں ۔ شام محفل نعت میں شرکت کرتے ہیں تو رات کسی محفل وعظ بیان میں شریک رہتے ہیں ۔ رات کے پچھلے پہر ریسرچ اسکالروں کے مقالوں کا مطالعہ کرتے ہیں اسی لیے ان کے دولت خانے میں مال و دولت کے بجائے تنقیدی کتابیں احادیث کی جلدیں اور مقالوں کے انبار لگے ہوئے ہیں ۔ تاحال دو تصانیف کے مصنف ہیں ان کی ادارت میں گلبرگہ یونیورسٹی شعبہ اردو کے تحت کوئی آدھا درجن مجلّے شائع ہو چکے ہیں ۔ سال 1991 میں انہیں نعت گوئی پر کل ہند ایوارڈ (گولڈ میڈل) ملا ہے تو سال 2002 میں کرناٹک اردو اکاڈمی نے انہیں اکاڈمی ایوارڈ سے نوازا ہے ۔ ملک کے مختلف شہروں اور یونیورسٹیوں میں منعقدہ کوئی سو سے زائد سیمناروں اور ادبی اجلاسوں میں مقالے سنا چکے ہیں ۔ حکومت ہند کی جانب سے منعقدہ کل ہند صوفی کانفرنس میں شرکت کر چکے ہیں ۔ کوئی سات ریسرچ اسکالروں نے ان کی رہنمائی میں پی ۔ ایچ ۔ڈی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں ۔ اکبر صاحب کی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے ان کی قلمی کاوشیں اور مقالے یونیورسٹی سیمناروں تک محدود ہوکر رہ گئے ہیں ۔ انہیں ملک اور بیرونی ملک کے معیاری ادبی رسائل میں لکھنے اور چھپنے کی فرصت نہیں مل پائی ۔ اب تو پروفیسری کی ذمہ داری کا طوق گلے سے اتر چکا ہے امید ہے اکبر صاحب ادبی رسائل اور جرائد کی جانب توجہ دیں گے ۔

اِدھر چند دنوں سے ہمارے دماغ میں عبدالحمید اکبر صاحب کا خاکہ قلم بند کرنے کی کھیر پک رہی تھی ڈاکٹر ماجد داغی ، جناب اکرم نقاش ، ڈاکٹر منظور احمد دکنی اور ڈاکٹر غضنفر اقبال نے ہماری کھیر کی آگ کو بھڑکا دیا ۔

ہم نے ڈاکٹر عبدالحمید اکبر صاحب کا خاکہ لکھا ہے یا اڑایا ہے جو بھی ہے آپ کے سامنے ہے !!

☆......○......☆

منی آرڈر فارم پر مکمل پتہ و فون نمبر لکھیں اور
صراحت فرمائیں کہ رقم کس لیے ارسال کی گئی ہے
منی آرڈر کی رسید اپنے پاس محفوظ رکھیں

منظور وقار
گلبرگہ

محبّ کوثر: چلتی ہوئی غزلوں کا شاعر

سانولا سلونا رنگ ، اونچا قد (اونچے عزائم کی نشانی) لمبی ناک (اتنی لمبی کے جس میدان میں گھس پڑیں ، اس میدان کی ناک کہلائیں ، چال رعب دار، لباس پروقار، آواز گرجدار۔آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ہم کہیں کسی فلمسٹار کا جغرافیہ تو بیان نہیں کررہے ہیں ۔ایسی کوئی بات نہیں اردو ادب انڈسٹری کے ممتاز شاعر محبّ کوثر کا ہے۔ہم یہاں یہ بتانا ضروری نہیں سمجھتے کہ محبّ کوثر صاحب کب پیدا ہوئے ؟ اور کیوں پیدا ہوئے؟ کیونکہ ہمارے ناقص خیال میں اس طرح کے سوالات اکثر اس شاعر کے بارے میں اٹھائے جاتے ہیں جو گھر والوں کے لیے بوجھ ہوتا ہے۔یا اردو والوں کے لیے ''متبرک'' محبّ کوثر صاحب کے گیسو دراز ہیں اور نہ ہی ان کے چہرے پر مہندی سے رنگی ہوئی لمبی داڑھی ہے ۔ ایسی حالت میں محبّ کوثر صاحب کی شخصیت اردو والوں کے لیے ''متبرک'' کہلانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے ۔ البتہ ہم یہ راز آپ لوگوں پر منکشف کریں گے کہ ہم محبّ کوثر صاحب کو کب سے جانتے ہیں اور کیوں جانتے ہیں ۔۔!

ہمیں پچھلے پندرہ برسوں سے کل ہند مشاعرے '' سماعت'' کرنے کا شوق اس طرح ہے جس طرح بعض لوگوں کو پڑوسیوں کے لڑائی جھگڑے دیکھ کر لطف اٹھانے کا ۔ ہمارے کمزور حافظہ کے مطابق پچھلے پندرہ سالوں میں گلبرگہ میں جتنے کامیاب کل ہند مشاعرے ہوئے ہیں ان کے اناونسر محبّ کوثر ہی رہے ہیں ۔ مشاعرے چلانے اور شعرا کو پیش کرنے کا انداز محبّ کوثر صاحب کا اپنا ایک خاص انداز ہے ، جس کو اب تک لاکھوں نہیں تو ہزاروں سامعین سراہ چکے ہیں ۔ محبّ کوثر کل ہند مشاعروں کی صرف نظامت ہی نہیں کرتے بلکہ ہر بار دو چار نئے شاعروں کو آزمائش کے طور پر پیش کرتے ہیں ۔ بلاشک وشبہ کل ہند مشاعروں کو کامیاب بنانے میں کوثر صاحب کی کمپیرنگ کا کافی لمبا ہاتھ ہے ۔اصل میں اردو شاعری (اپنی ہو یا دیگر شعرا کی) کوثر صاحب کے سر پر اس طرح سوار رہتی ہے کہ وہ ہر وقت شعروں کے جنگل میں مست ہاتھی کی طرح جھومتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوثر صاحب کے آگے ہر موضوع پر شعر اس طرح ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں جس طرح منسٹروں کے آگے ان کے چمچے عرف پارٹی ورکرس۔

گفتگو چاہے کسی موضوع پر ہو رہی ہو ہر بات کے جواب میں کوثر صاحب ایک عدد شعر سنا دیتے ہیں۔پچھلے دنوں ہمیں کوثر صاحب کے ساتھ سفر کرنے کا موقع ملا۔سفر لمبا تھا اور ریل گاڑی کا ڈبہ تقریبا خوش قسمتی سے خالی تھا۔ ہمارے ہمسفروں میں دو تین شعرا کے علاوہ شاعروں کو دور سے دیکھ کر مسکرانے والے پانچ چھ عام مسافر تھے ۔ اجتماعی گفتگو کا آغاز ہوتے ہی کوثر صاحب کی ایک طرفہ بیت بازی کا مقابلہ چل پڑا۔ہم کسی بات کا جواب ڈھونڈ ھنے بھی نہیں پاتے تھے کہ کوثر صاحب کھٹ کے ساتھ ایک شعر داغ کر ہمیں لا جواب کر دیتے ۔ کوثر صاحب کے اشعار سنانے کا سلسلہ چل پڑا تو ہم سر پکڑ کر سوچنے لگے ۔ کاش دو چار شعر بھی اگر ہمیں یاد ہوتے تو آج ہم کوثر صاحب کے آگے یوں شرمندہ تو نہ ہوتے ۔ کوثر صاحب گفتگو کے دوران اشعار کے علاوہ لطیفے بھی سناتے ہیں ۔ اپنے لطیفوں سے دوسروں کو تو خوب ہنساتے ہیں مگر خود مسکرا کر رہ جاتے ہیں ۔ بحث کے دوران جن

شعرا کو پسند کرتے ہیں انہیں دل کھول کر داد دیتے ہیں اور جن شعرا کو پسند نہیں کرتے ان کی ایسی کلاس لیتے ہیں کہ بیچارے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے ۔ کوثر صاحب اچھوں کے ساتھ بہت اچھے ہیں اور بروں کے ساتھ اتنے برے کہ اچھے اچھے سرپھروں کے چھکے چھڑا دیتے ہیں ۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ دور کسی سے دبنے اور دم دبا کر بھاگنے کا نہیں ۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا ہے۔

ایک دن کوثر صاحب نے باتوں باتوں میں ہم سے کہا ۔ ''وقار! تم بہت بھولے بھالے سیدھے سادے ہو۔ تمہیں بعض شعرا کی سازشوں، ادبا کی بے ادبیوں اور ناقدین کے نخروں کا صحیح اندازہ نہیں ۔ ہر آدمی کو اپنے سے عظیم سمجھ کر ہوں میں ہاں ملایا کرتے ہو اور ہمیشہ ہنگاموں سے اس طرح دور بھاگتے ہو جس طرح امن پسند لوگ فساد زدہ بستی سے ۔ ہم نے جواب دیا آپ ہمیں کچھ بھی کہیئے ہم ہنگاموں سے واقعی گھبراتے ہیں ۔ حد تو یہ ہے کہ اگر کوئی ہنگامہ آگے بڑھ کر ہمارے ایک گال پر تھپڑ مارتا ہے تو ہم فوراً دوسرا گال پیش کر کے اس ہنگامے کو حیرت زدہ کر دیتے ہیں ۔ کوثر صاحب منہ کو ہاتھ لگا کر بولے وقار! تم اس قدر گاندھی وادی ہو کر اس سازشی دنیا خصوصاً ادبی دنیا میں کس طرح جی رہے ہو۔؟!

کوثر صاحب کے ساتھ یہ مصیبت ہے کہ وہ شہر کے شعرا اور ادبا کے ساتھ وقتاً فوقتاً الجھتے رہتے ہیں ۔ کسی ادیب سے اس کے افسانہ پر بحث کر رہے ہیں تو کسی شاعر سے اس کی شاعری کوثر صاحب جہاں جہاں کسی تخلیق میں کوتاہی دیکھ لیتے ہیں ۔ فوراً اس کی جانب اشارہ کر دیتے ہیں ۔ کوثر صاحب کی اس بے باک تنقید سے شہر کے چند شعرا ادبا ان سے نہ صرف گھبراتے ہیں بلکہ ناراض رہتے ہیں ۔ ایک مرتبہ ہم نے شہر کے ایک سینیئر شاعر کے سامنے ایک غزل کے چند شعر سنائے ۔ شاعر موصوف جھوم جھوم کر داد دیتے رہے ۔ ہم نے جب یہ انکشاف کیا کہ غزل ہذا محبّ کوثر کی تھی تو اس انکشاف کے بعد شاعر موصوف کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور چہرہ اچانک بھیگے پاپڑ کی طرح نرم پڑ گیا ۔ منہ لٹکا کر بولے ''اچھا یہ غزل محبّ کوثر کی تھی تبھی تو مجھے جگہ جگہ کھٹک رہی تھی''۔ اس وقت ہمیں فوراً ایک لطیفہ یاد آیا۔ ''ایک شام جب شوہر گھر پہونچا تو بیوی نے بڑے جوشیلے انداز میں بتایا۔

''اجی! دوپہر میں ایک آدمی ہوا میں پرندے کی طرح اڑ رہا تھا۔ ہزاروں لوگ حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے ۔ میں تو اس چمتکاری پر لٹو ہوگئی ۔ شوہر نے جواب دیا ''اری دیوانی وہ آدمی کوئی اور نہیں میں ہی تھا شوہر کا جواب سن کر بیوی نے منہ بگاڑ کر کہا'' اچھا تو وہ تم تھے تبھی تو تیڑھا میڑھا اڑ رہے تھے ۔!

حضرات اس لطیفہ کا مقصد کسی کو ہنسانا نہیں بلکہ اس بات کی طرف توجہ مبذول کروانا ہے کہ آج ہمارے شہر میں کوثر صاحب جیسے کئی قابل شعراء اور فنکار گھر کی مرغی دال برابر بن کر رہ گئے ہیں ۔ اس کا احساس خود محبّ کوثر کو بھی ہے ۔

محبّ کوثر صاحب خاموش بیٹھنے والے آدمی نہیں وہ ہمیشہ حرکت میں رہتے ہیں ۔ کبھی مشاعروں کے انعقاد کے لئے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں تو کبھی مشاعروں میں شرکت کی تیاری کر رہے ہیں ۔ کسی نوجوان شاعر کی غزل پر اصلاح دے رہے ہیں تو کبھی کسی ابھرتے ہوئے گلوکار کو غزل گائیکی کی مشق کر وا رہے ہیں ۔ کبھی اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی پر غور و فکر کر رہے ہیں تو کبھی اردو والوں کی خود اپنی زبان کے تئیں سرد مہری پر آنسو بہا رہے ہیں شاید کوثر صاحب جانتے ہیں کہ حرکت اور فکر ہی زندگی ہے جہاں حرکت اور فکر کا فقدان ہوگا انسانی زندگی بے مقصد اور بے رنگ ہو کر رہ جائے گی ۔ ان کی طویل ادبی خدمات کو ان کے چاہنے والوں نے محسوس کیا تو 1989ء میں گلبرگہ میں دوروزہ عظیم الشان یادگار ''جشن محبّ کوثر'' کا انعقاد عمل میں لایا گیا ۔ اس یادگار جشن کی بازگشت آج بھی شہر کے گوشے گوشے میں سنائی دے رہی ہے ۔

محبّ کوثر صاحب سرکاری اسپتال میں فارماسیٹ ہیں مگر دراصل نیم ڈاکٹر (نیم حکیم خطرہ جاں نہیں) ہیں ۔ انہوں نے

اپنے مکان پر یوں تو نیم ڈاکٹری کا ''نیم پلیٹ'' نہیں لگایا ہے۔ پھر بھی نئے لوگ نئی نئی بیماریوں کا علاج کروانے کے لیے ان کے پاس پہنچتے ہیں۔

کوثر صاحب خود ''ہارٹ اٹیک'' کے مریض میں اس لیے اپنے شاگرد وقار ریاض کی غزلوں کو ''درد دل'' کی دوا سمجھ کر دن میں دو وقت بلاناغہ سنتے ہیں۔ کوثر صاحب کے عام دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ مگر خاص دوستوں کا محدود۔ جب وہ بازار سے نکلیں گے تو سر اٹھا کر چلیں گے۔ شائد کوثر صاحب سر جھکا کر چلنا آدمی کے احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں۔ سیاست میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں مگر سیاسی لوگوں سے گہرا میل جول ہے۔ خصوصا منسٹروں سے میل جول فی زمانہ ضروری ہے کیونکہ انسانی زندگی میں ضرورت بول کر نہیں آتی۔ ہم محبّ کوثر صاحب کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ ایک اچھے شاعر ہی نہیں ایک اچھے انسان بھی ہیں (یہاں اچھے شاعر سے مراد عوامی شاعر اور اچھے انسان سے مراد ہر طرح کی بری عادتوں سے دور) ویسے ہمارے سر میں ایک قول سما گیا ہے جس پر ہم عمل کرتے ہیں ''ہنرور کی ناقدری سے بے ہنری کو فروغ ملتا ہے''۔ اچھے انسانوں اور سچے فنکاروں کو نظر انداز کرنے سے کم ظرفوں کو اوپر اٹھنے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔

محبّ کوثر صاحب 'گھر' اور بیوی بچوں کا پورا خیال رکھتے ہوئے بھی پچھلے تقریبا ۳۸ سال سے اپنی ایک محبوبہ سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں محبت کیوں نہ کیوں نہ کریں ان کی محبوبہ ہے بھی بلا کی خوبصورت۔ وہ ہمیشہ ان کے ذہن و دل پر چھائی رہتی ہے۔ ان کے چاہنے والے بھی اس کے بڑے عاشق ہیں۔ جی ہاں اردو غزل کو ٹوٹ کر چاہنے کے باوجود غزلوں کا انبار لگاتے نظر نہیں آتے۔۔

☆......○......☆

رؤف خوشتر (بیدر)

''آپ کا لکھا ہوا طنزومزاح سے بھرپور رپور تاژ حیدرآباد چلو حیدرآباد چلو ماہنامہ شگوفہ میں نظر نواز ہوا۔ رپورتاژ امید سے زیادہ شگفتہ دلچسپ اور پر لطف ہے ساتھ ہی علامہ پاکھنڈی لڑکپن سے ہوتے ہوئے شباب کی منزلیں طے کررہے ہیں اللہ کرے زور عمر اور زیادہ ،کردار سازی بہت بڑی چیز ہے۔ رپورتاژ کیا ہے دریائے لطافت اور ظرافت ہے خود کو پردے میں رکھ کر دوسروں کو اجاگر کرنا کوئی منظور وقار سے سیکھے ،رپورتاژ پڑھ کر دل کہتا ہے کہ آپ ہمیشہ دوروں پر رہو تا کہ ہم لوگ ایسے دلچسپ اور معلومات سے بھرپور رپورتاژ پڑھتے رہیں۔''

ڈاکٹر فوزیہ چودھری (بنگلور)

''منظور وقار کی چٹ پٹی تحریریں اور منی افسانے میری نظر سے گزرے تھے لیکن پہلی بار بنگلور میں ضیاء جعفر پر خاکہ پڑھتے ہوئے سنا بھی سنا کیا ایک احساس جاگا کہ شاعر مشاعروں کو لوٹتے ہیں تو ادیب بھی محفلوں کو زعفران زار بنا سکتے ہیں۔''

(روزنامہ سیاست بنگلور 2009-03-15)

ڈاکٹر حبیب ضیا (حیدرآباد)

''زندگی کے حقائق کو مزاح کا روپ دینا انتہائی مشکل کام ہے۔ مزاح نگار کے قلم کی ذراسی لغزش سے مزاح پھکڑ پن بن جاتا ہے لیکن منظور وقار اس فن کو خوب جانتے ہیں توقع ہے منظور وقار سلیمان خطیب اور مجتبیٰ حسین کی روایت کو جاری رکھیں گے۔''

(روزنامہ سلطان

بنگلور(1990-07-19)

......☆......

دے کے خط ...... (مراسلے)

مدیرِ محترم مصطفیٰ کمال صاحب دام اقبالہ۔
سلام وکورنش!
خیریت ماموجود اور خیریت شما مطلوب۔

دام اقبالہ کی دعائے خیر اس لیے کہ ان دنوں آپ اِدھر اُدھر اور یہاں وہاں سے خوب اعزازات وانعامات بٹور رہے ہیں اور 'شگوفہ' کے دے کے خط کالم میں مراسلہ نگار بھی مبارکبادیوں کے ساتھ آپ کی تعریفوں کے پل باندھ رہے ہیں۔ واقعی معلوم ہوا کہ آدمی نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا کے مصداق بے نیاز ہوکر اپنی مساعی کو بحسن وخوبی انجام دیتا رہے تو ایک نہ ایک دن اسے محنت کا پھل ضرور ملتا ہے۔ آپ کی عزت افزائیوں پر خوشی ہوئی خدا کرے کہ آپ کو اور بلند درجات حاصل ہوں اور کامیابیاں آپ کے قدم چومیں۔ آمین

حضور! 'شگوفہ' کے صفحات کے لیے 'اہلیہ سے عشق' حاضر ہے۔ جلد شائع کریں تاکہ ہم اپنی اہلیہ کو دکھا سکیں۔۔

زیادہ حد ادب والسلام　　خاکسار

مختار ٹونکی، راجستھان

محترم مصطفیٰ کمال صاحب۔ السلام علیکم۔

ماہنامہ شگوفہ (مئی ۲۰۱۹) موصول ہوا۔ سرورق الٹتے ہی دو تصاویر پر نظر پڑی ان میں اُن یادگار لمحات کو قید کیا گیا ہے جن میں آپ کو سال ۲۰۱۹ کا سالار ملت ایوارڈ سے نوازا جارہا ہے۔ ان لمحات کو دیکھ کر میرے اندر خوشی کے غنچے کھل اُٹھے تھے کہ صفحہ ۴ پر سالار ملت ایوارڈ دیئے جانے کی تفصیل پڑھ کر تو پورا جسم خوشی سے سرشار ہوگیا۔ ادھر چند ماہ کے دوران آپ کو جس تواتر کے ساتھ قومی اور بین الاقوامی ایوارڈز اور اعزازات سے نوازا جارہا ہے۔ اس کو دیکھ کر یقین کرنا پڑتا ہے کہ جو بھی انسان اپنے کام اور مقصد کے تئیں پر عزم پر اعتماد اور ثابت قدم ہوتا ہے ایک دن اس کی صلاحیتوں اور کاوشوں کو دنیا تسلیم کرہی لیتی ہے۔ اس کے لیے ایک صبر آزما دور سے گزرنا بھی پڑتا ہے۔ مگر آج کی نسل بہت جلد سب کچھ پانا چاہتی ہے یہ ممکن نہیں۔

حسب حال سلسلہ گوشہ قلمکاروں کے تحت اس بار کے این واصف صاحب کا گوشہ شامل ہے۔ آپ نے اس گوشے کے ذریعہ واصف صاحب کی مزاح نگاری، خاکہ نگاری اور دیگر قلمی کاوشوں کا اعتراف کیا ہے۔ انہیں عزت بخشی ہے۔ دیگر مشمولات میں فیاض احمد فیضی صاحب اور نورالحسنین صاحب کے خاکے، سیما شکور کا انشائیہ قابل مطالعہ ہیں۔ چورن بھی چٹ پٹا اور پر مزاح ہے۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

فقط آپ کا

منظور وقار، گلبرگہ

مکرمی کمال بھائی۔

الف مبروک، بہت سارے ایوارڈ کی اور عمرہ و زیارت کی خصوصی مبارکباد۔ جناب حشمت سہیل شکاگو میں مقیم مزاحیہ شاعری کرتے ہیں۔ ان کا کلام روانہ کررہا ہوں۔ میں انشاء اللہ ۳۰ اپریل کو حیدرآباد آرہا ہوں۔ انشاء اللہ ملاقات ہوگی۔

آرکیٹکٹ عبدالرحمٰن سلیم، شکاگو

محترم جناب ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب
السلام علیکم

آج ۷ مئی اور یکم رمضان المبارک ہے۔ اس لیے کچھ اور تحریر کرنے سے قبل رمضان المبارک کی مبارکباد۔

اور پھر کئی ہزار مبارکبادیں 'شگوفہ' پیروڈی نمبر کے لیے۔

کیسی کیسی خوبصورت تتلیوں کے رنگوں سے رنگی اور اسی کی طرح ہلکی پھلکی قہقہہ بار پیروڈیاں فضل جاوید صاحب نے مزاح کے دسترخوان پر چنی ہیں کہ بس!! سبحان اللہ۔ واہ واہ۔ بہت ساری پیروڈیاں پچھلے کئی برسوں میں پڑھی ضرور ہیں لیکن اب بھول بھال گیا تھا۔ خصوصاً دلاور فگار، مجید لاہوری، شوکت تھانوی، راجہ مہدی علی خاں اور سید محمد جعفری کی پیروڈیوں نے اس وقت بھی قہقہے لگانے پر مجبور کیا تھا اور آج پھر اسی بات کا اعادہ

ہوا ہے۔کیا کہنے۔ہاں، عاشق محمد غوری کی پیروڈیاں میرے لیے نئی ہیں اور مجھے بے حد پسند آئی ہیں۔

فضل جاوید صاحب اور شگوفہ کے کارکنان کے لیے بہت بہت مبارکباد۔خدا حافظ۔ نیاز مند

ملک بزمی (پربھنی)

جناب ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال!

السلام علیکم۔

مئی ۲۰۱۹ء کا شگوفہ دستیاب ہوا۔ممنون ہوں۔

جدہ میں ' سالار ملت ' برائے ادبی خدمات ایوارڈ حاصل کرنے پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

نیک خواہش کے ساتھ۔ بانو سرتاج، چندراپور

محترم ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب۔

اسلام علیکم۔

شگوفہ کی گولڈن جوبلی سالگرہ کے بعد سے حکومت ہند کے علاوہ مختلف ادبی تنظیموں کی جانب سے صحافتی اعزازات سے نوازے جانے کا سلسلہ مزید دراز ھوتا جارہاہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی بزم اتحاد جدہ کی جانب سے سالار ملت صلاح الدین اویسی ادبی انعام 2019 ایک پروقار تقریب میں مدیر شگوفہ کو پیش کیے جانے پر صمیم قلب سے بہت بہت مبارک باد قبول فرمائیں۔ اس ماہ کے اداریہ سے قارئین کو سالار ملت کی ادبی سرگرمیوں اور وابستگی کے بارے دی گئی معلومات کے لیے سبھی قارئین مدیر شگوفہ کے ممنون ومشکور ہیں۔

ماہ مئی 2019 کا شگوفہ 25 مئی تک بھی اجنتہ بک اسٹال پر بذریعہ ڈاک موصول نہیں ہوا۔ڈاک محکمہ کے نظامِ ترسیل سے ہر کوئی نالاں ہے۔خیر اس بندۂ ناچیز نے اپنی غیر حاضری کو ٹالنے نیز آپ کی اور قارئین شگوفہ کی سمع خراشی میں خلل نہ ہونے پائے اس لیے انٹرنیٹ کا سہارا حاصل کرلیا ہوں۔

مئی ماہ کا شمارہ مشہور صحافی کے۔این۔ واصف صاحب کے خاکوں پر مشتمل خصوصی گوشہ ہے۔عذرا نقوی، غوث ارسلان، محمد سیف الدین اور ڈاکٹر عذیر غازی نے کے۔این۔ واصف کی تنقیدی صلاحیتوں کی مدلل پذیرائی کی ہے۔کے۔این واصف کی خاکہ نگاری سے قارئین کو روشناس کرانے کے لیے سبھی ناقدین کو صمیم قلب سے بہت بہت مبارک باد۔

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے اپنے تحقیقی مقالہ میں بڑی عرق ریزی سے نہایت مدلل انداز میں غالب کے خطوط کے حوالے سے غالب کو اردو کا اولین خاکہ نگار ثابت کیا ہے۔ اشفاق صاحب کے پرمغز مقالہ کے باعث شگوفہ کا یہ شمارہ خاکہ نگاری پر تحقیقی اثاثہ کہلانے کا مستحق بن چکا ہے۔

اس ماہ کے دیگر مشمولات میں نورالحسنین نے بشر نواز صاحب پر عمدہ خاکہ پیش کیا ہے۔اسی طرح ڈاکٹر عبدالستّار دلوی کا مرہٹی ڈرامہ کا اردو ترجمہ "خاموش عدالت جاری ہے۔" کی رسم اجرا پر ڈاکٹر فیاض احمد فیضی کے دلچسپ خاکے نے بھی خوب گدگدایا۔ سیما شکور نے بھی شوہروں پر خوب طبع آزمائی کی ہے۔ علاوہ ازیں شعبہ منظومات میں شامل تمام تخلیقات بھی لاجواب ہیں۔

23 مئی جو نتائج ظاہر ہوے ہیں اس کے نتیجہ میں موجودہ حکومت دوسری مرتبہ پانچ سال کے لیے ہم پر مسلط ہوچکی ہے۔ دراصل ھندوستان کے شہری بہت ضدی ہیں اور سب نے ٹھان لی ہے کہ جب تک ان کے بنک اکاؤنٹ میں پندرہ لاکھ جمع نہیں ہو جاتے اس وقت تک وہ بار بار اسی حکومت کو جتاتے رہیں گے!

ان دنوں ڈاکٹر علیم خان فلکی کا ملت کے نام ایک پیغام سوشیل میڈیا پر سرگرم ہے۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ خیر کا معاملہ فرمائے آمین۔ اس الیکشن میں اورنگ آباد سے ایم آئی ایم کے سید امتیاز جلیل نے مخالف امیدواروں کو ایسی کراری مات دی ہے کہ ان کی موجودہ جیت کے صدمہ سے حیران پریشان وحواس باختہ ہے۔ تقریباً 40 سال قبل قاضی سلیم شہر اورنگ آباد سے پارلیمنٹ کے لیے منتخب ہوئے تھے۔آج تک ہماری پارلیمنٹ میں بریانی کے چرچے تھے چلواب نان خلیہ بھی شامل ہوگیا ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ، اورنگ آباد

محترم ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب۔ السلام علیکم!

محترم! اچھا ہوا کہ آپ نے 'احمد' کو 'معین' سے بدل دیا۔ 'احمد عثمانی' کے بجائے 'معین عثمانی'۔

یہ خوبی شگوفہ کی ہے۔ 'معین' لکھ کر آپ نے ہندو پاک میں اکیلے احمد عثمانی کو 'معین' کا جوڑی دار بنا دیا۔ اس تبدیلی کے لیے شکر گزار ہوں۔ لیکن اب احمد عثمانی ہی لکھوائیں نوازش ہوگی۔ 'شگفتہ زار' کی رسم اجرا کے فوٹو شایع کرنے کے لیے شکر گزار ہوں۔

احمد عثمانی

ایڈیٹر ماہنامہ بیباک، مالیگاؤں

مدیر محترم۔ السلام علیکم

ستمبر ۱۹۴۸ء میں سقوط حیدرآباد دکن کے بعد جو صورت حال حیدرآباد کے اردو داں عوام کی تھی وہ بڑی غم زدہ داستان پر مشتمل ہے۔ اس زمانے میں جس نے ہم جیسے روتی صورتوں کے لیے ہنسنے ہنسانے کا بیڑہ اٹھایا تھا وہ تھے زندہ دلان حیدرآباد اور اس کے ترجمان اردو ماہنامہ شگوفہ اور اس کے مدیر محترم ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے یہ کمال کر دکھایا کہ طنز و مزاح کو دوسرے درجہ کا ادب کہنے والوں کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ شعور کی بلندی اور سماجی اصلاح کے کام کرنے والے ادیبوں اور شاعروں کو ایسے ہی ادب کی ضرورت ہے۔ اور پھر ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے اس ادب کو اور اس ادب کے لکھنے والوں کو جن میں ادیب بھی اور شاعر بھی دونوں شامل ہیں وہ اعتبار عطا کیا کہ ساری دنیا اس کی دیوانی ہوگئی۔ زندہ دلان حیدرآباد اور ماہنامہ شگوفہ اور اس کے مدیر محترم کے توسل سے کتنے بلند پایہ طنز و مزاح نگار پیدا ہوئے اور دنیائے ادب سے اپنا لوہا منوایا اس سے سب اردو دنیا واقف ہے۔ لکھنو کے اودھ پنچ نے تو ۳۵ سال بعد دم توڑ دیا۔ لیکن ماہنامہ شگوفہ نے سال گذشتہ اپنی گولڈن جوبلی منائی۔ اب یہ رسالہ ۵۱ ویں سال میں داخل ہوگیا ہے۔ ہر سال اس کی (زندہ دلان حیدرآباد کی) سالانہ تقریبات میں جس میں ایک آل انڈیا مزاحیہ/ مزاحیہ مشاعرہ بھی منعقد ہوتا ہے۔ لکھنے اور سننے کے دیوانوں سے مشاعرہ گاہ کھچا کھچ بھرا ہوا ہوتا ہے۔ شہر حیدرآباد کے علاوہ دوسرے اضلاع سے بھی سامعین جوق در جوق شامل ہوتے ہیں۔ مدیر محترم راقم الحروف سے بے حد محبت رکھتے ہیں اور خاکسار ڈاکٹر صاحب کو اپنا ادبی استاد گردانتا ہے۔ سید صاحب کے اداریہ پھر ملیں گے سے ہی اس فن لطیف کا اچھا گیان حاصل کیا۔ آپ کی تحقیق و تنقید معیاری ادب اور فن پر حرف آخر ہوتی ہے۔ وقتاً فوقتاً جو بلند پایہ طنز و مزاح نگاروں کے شگوفہ کے گوشے نکلتے ہیں وہ بھی ڈاکٹر صاحب کی عرق ریزی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس لیے خاکسار کی یہ آرزو تھی کہ ان کی شال پوشی و گل پوشی کروں، دعائیں بھی دوں اور دعائیں لوں بھی چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی دہلی، اورنگ آباد سے واپسی کے بعد جہاں ان کی تہنیت ہوئی اور پر خلوص محبتوں سے خوب پذیرائی ہوئی واپسی کے بعد یہ آرزو پوری کرنے ان کے دفتر چلا گیا کہ پتہ نہیں پھر یہ موقع ملے نہ ملے گلپوشی کروں، چنانچہ زاید از پچاس سال سے بلا انقطاع شایع ہونے والے یہ ادبی طنز و مزاح کی بلندی کیا ہوتی ہے یہ اشکارا کرنے والے مدیر محترم کے دفتر جا کر اپنی یہ آرزو پوری کی اور خوشی حاصل کی۔ اس موقع پر لی گئی تصویر بھی اور شگوفہ کے سالنامہ کی فوٹو بھی دونوں WhatsApps کے ذریعہ برائے ادبی ایڈیشن روانہ خدمت ہے۔ برائے شگوفہ۔ فقط مخلص

حافظ محمد جیلانی، حیدرآباد

محترمی!

بزم اتحاد جدہ کی جانب سے ۱۲ اپریل کو منعقدہ سالار ملت ایوارڈ کے جلسے میں محترم احمد الدین اویسی صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ ۵۱ سال سے زائد عرصے تک شگوفہ جاری رکھنا، ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اس پر ستم یہ بھی ہوا کہ چند افراد شگوفہ کے خلاف سازش کرتے ہوئے مہم چلا رہے تھے۔ ان حالات میں ایک رسالہ پابندی سے نکالنا کوئی آسان بات نہیں۔ شگوفہ کی مطبوعہ خبر میں محترم اویسی کے ان خیالات کا ذکر نہیں ہے جو ایک اہم نکتہ ہے۔ قارئین کرام کو اس کی تفصیل بھی سنائیں۔

سلمان، جدہ (سعودی عرب)

پھر ملیں گے............

اداریہ

غیر منقسم پنجاب کے شہر لاہور میں بسنے والے خوش مزاج، شوخ وطرار بذلہ سنج ادب دوست شہریوں کو زندہ دلان لاہور کہا جاتا تھا۔ یہ کس کی اختراع ہے اس تعلق سے کئی روایتیں ہیں۔ لوگ بڑی خوش دلی سے یہ اعزاز عطا کرتے یا قبول کرتے تھے لیکن لاہور کے کسی ادارے کو اس نام سے کبھی موسوم نہیں کیا گیا۔

آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے پروڈیوسر قاضی عیاذ انصاری نے پہلی بار ایک مزاحیہ مشاعرہ ۱۹۶۱ء میں زندہ دلان حیدرآباد کے عنوان سے سامعین کی موجودگی میں ریڈیو سے نشر کیا۔ جو اپنی انفرادیت اور انوکھے پن کی وجہ سے بے حد پسند کیا گیا۔ ان دنوں حیدرآباد میں ڈرامہ، موسیقی اور مزاحیہ خاکے، ممکری وغیرہ کے فروغ کے لیے ایک انجمن فائن آرٹس اکیڈیمی سرگرم عمل تھی اور اسے مابعد پولیس ایکشن ناموافق اور سرد ماحول میں بے حد مقبولیت حاصل ہوگئی تھی۔ اکیڈیمی کا ایک ادبی شعبہ تھا جسے زندہ دلان حیدرآباد کے نام سے موسوم کردیا گیا۔ جب کہ اس ادارے کے تمام ارکان زندہ دلی کے مظاہروں میں یکتا ہیں۔ اکیڈیمی کے ادبی شعبے کی سرگرمیوں میں مزاحیہ شعری محفلوں کا انعقاد خاص طور سے شامل تھا۔ فائن آرٹس اکیڈیمی (تشکیل ۱۹۵۳ء) کے ارکان نے کسی ایک شخص کی ادارے کے بانی کی حیثیت سے نشان دہی نہیں کی اور متفقہ خیال تھا کہ فائن آرٹس اکیڈیمی کی تشکیل کے موقع پر جو سینیئر اور فعال ارکان تنظیمی کاموں میں مشغول تھے وہی اس اکیڈیمی کے بانی کہلائیں گے۔ میں نے ۱۹۶۶ء میں روزنامہ رہنمائے دکن اور سیاست کے لیے سینیئر ارکان سے گفتگو کے بعد ان اداروں کا تعارف قلم بند کیا تھا جو بعد میں اختصار کے ساتھ شگوفہ (اپریل، مئی ۱۹۷۱ء) کے شمارے میں بھی شایع ہوا۔ اکیڈیمی کے ارکان میں بانی کے طور پر کسی ایک رکن کی عزت افزائی کے سلسلے میں سخت اختلاف تھا، اراکین نے یہ اصرار کہا تھا کہ تمام سینیئر اور فعال ارکان نے فائن آرٹس اکیڈیمی کی تشکیل میں حصہ لیا ہے۔

فائن آرٹس اکیڈیمی کے قدیم ارکان میں عزیز قیسی، اقبال قریشی، حمایت اللہ، ممتاز احمد، احمد رضوی، خورشید باورا، ایم اے رشید، سعید احمد اشرفین، سعید الحسن، مصطفیٰ علی بیگ، مجید مقبول، قمر الدین احمد خاں، صفدر حسین، عبدالصمد خاں، محمد یوسف اور سعادت علی خاں کے نام مجھے یاد ہیں۔

عزیز قیسی نے مدیر شگوفہ کے نام ایک مراسلے میں لکھا تھا کہ 'میرا تعلق فائن آرٹس اکیڈیمی سے اس کے آغاز سے ہی رہا۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ فائن آرٹس اکیڈیمی کے بنیاد کا پتھر رکھنے والے ہاتھوں میں میرا ہاتھ بھی تھا'۔

وہ زندہ دلان حیدرآباد کے بارے میں لکھتے ہیں:

'اکیڈیمی کے سرکردہ حضرات نے جس میں محمد حمایت اللہ کے ساتھ میں بھی شامل ہوں، اکیڈیمی کے ایک ادبی شعبے کے قیام کا منصوبہ بنایا۔۔

'اکیڈیمی کی جس میٹنگ میں ادبی شعبے کا نام زندہ دلان حیدرآباد رکھا گیا اس کی صدارت سینیئر مزاحیہ شاعر (جو اکیڈیمی کے نام سے برسوں پہلے سے مزاح اور طنز کی شاعری میں اپنا نام اور مقام بنا چکے تھے) علی صائب میاں کرنے والے تھے وہ کسی وجہ سے نہیں آسکے اور مجھے اس میٹنگ کی صدارت کرنی پڑی۔ اس میٹنگ میں ممتاز احمد، سرور ڈنڈا، س۔ا۔عشرت، رگھوبنسی نرمل، خواجہ بدیع الدین ماجد، مجید مقبول، حمایت اللہ، سعادت علی خاں، قمر الدین خاں، مصطفیٰ علی بیگ، ولی محمد آرٹسٹ شریک تھے'۔ (دے کے خط، مطبوعہ اپریل ۱۹۹۲ء)

فائن آرٹس اکیڈیمی مقامی سطح کے مشاعرے وقتاً فوقتاً منعقد کرتی رہی ہے۔ کل ہند صنعتی نمائش کے موقع پر بھی نمائش تھیٹر پر مشاعرہ منعقد کیا جاتا تھا۔ ۶ نومبر ۶۳ء کو نمائش میں اور ۴ نومبر ۶۵ء کو رویندرا بھارتی اور ۱۱ نومبر ۶۸ء کو گاندھی بھون میں بڑے اہتمام کے ساتھ مشاعرے منعقد کئے گئے۔ اکیڈیمی نے زندہ دلان حیدرآباد کے نام سے چار سالانہ ریاستی سطح کے مشاعرے ۱۹۶۲، ۱۹۶۳، ۱۹۶۴ اور ۱۹۶۵ء میں منعقد کیے۔ اردو ہال حمایت نگر میں منعقدہ ریاستی سطح کے اولین مشاعرے کا افتتاح نریندر لوتھر نے کیا تھا، جو ان دنوں ڈائرکٹر محکمہ تعلقات عامہ تھے۔ شعبۂ ادب کے داعیان رگھوبنسی نرمل اور بن لال یادو تھے۔ ۱۷ مارچ ۱۹۶۲ء کو منعقدہ اس مشاعرے میں سلیمان خطیب، حمایت اللہ، سرور ڈنڈا، مصطفٰی علی بیگ، مسافر نلگنڈوی، گستاخ، سرپٹ حیدرآبادی، احمد اللہ قادری، فرید گردہ، گڑبڑ حیدرآبادی اور بدیع الدین ساجد، عبدالصمد خاں، ظریف حیدرآبادی، فریس، نصرت نے کلام سنایا۔

تاہم اس مشاعرے سے قبل چھوٹے پیمانہ پر بھی مزاحیہ مشاعرے منعقد ہوتے رہے۔ مزاحیہ مشاعروں کے تعلق سے اردو روزناموں کے مطبوعہ اشتہارات اور دعوت ناموں وغیرہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشاعرے فائن آرٹس اکیڈیمی کے زیر اہتمام منعقد ہوتے تھے اور مشاعرے کو مستقلاً زندہ دلان حیدرآباد کا عنوان دیا جاتا تھا۔ گویا یہ بالکل ریڈیو کے مزاحیہ مشاعرے کی اتباع تھی۔ اخباروں نے لکھا کہ 'حیدرآباد میں اب تک اتنا بڑا مزاحیہ مشاعرہ منعقد نہیں ہوا تھا'۔ مزاحیہ مشاعروں کے انعقاد کے موقع پر شعرا کی کمی کے باعث دو ایک ناشاعر فن کاروں کو کلام فراہم کیا جاتا اور وہ مشاعرے میں بڑی آن بان، اعلی شاعروں سے زیادہ اعتماد اور فن کارانہ انداز میں یوں کلام سناتے کہ اصلی شاعر اپنے کلام کی 'ملکیت' سے دست بردار ہوجانے میں عافیت محسوس کرتے تھے! ۔ اصلاح شعر کے کام رگھوبنسی نرمل انجام دیتے تھے۔ مزاحیہ مشاعروں کی ابتدائی شہرت کے متوازی اس دور میں مجتبیٰ حسین روزنامہ سیاست کے فکاہی کالم شیشہ و تیشہ لکھ رہے تھے اور ادبی حلقوں میں تیزی کے ساتھ متعارف ہو رہے تھے۔ انہوں نے ۱۹۶۶ء کے آغاز پر ایک ادبی ادارے حلقہ ارباب ذوق کے معتمد حفیظ قیصر کے ساتھ مل کر طنز و مزاح نگاروں کی کل ہند کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا۔ فیصلے کے دو ایک مہینوں کے بعد انہیں خیال ہوا کہ حلقہ ارباب ذوق کے مقابلے میں زندہ دلان حیدرآباد موزوں اور پرکشش نام ہے اور فائن آرٹس اکیڈیمی کے تجربہ کار فن کاروں کی مدد سے تقاریب کو کامیاب بنایا جاسکتا۔ چنانچہ ایک مشترکہ میٹنگ میں فیصلہ ہوا کہ ۱۴ اور ۱۵ مئی ۱۹۶۶ء کو مزاح نگاروں کی کل ہند کانفرنس زندہ دلان حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقد ہوگی۔ بھارت چند کھنہ کی صدارت میں استقبالیہ کمیٹی تشکیل دی گئی۔ سیاست، رہنمائے دکن اور ملاپ کے مدیر نائب صدور، مجتبیٰ حسین معتمد عمومی، حمایت اللہ اور حفیظ قیصر نائب معتمد، رحیم خاں خازن اور مصطفٰی کمال آفس سکریٹری منتخب ہوئے۔

طے ہوا کہ افتتاحی جلسہ، ادبی اجلاس، سمپوزیم اور بزنس سیشن کا انعقاد حلقۂ ارباب ذوق کے ذمے ہوگا۔ ناصر کرنولی، مصطفٰی کمال اور حفیظ قیصر کی ادارت میں ایک سوویز شایع ہوگا جس کے لیے حاصل کئے جانے والے اشتہارات کی رقم سے اخراجات کی پابجائی ہوگی۔ کل ہند مزاحیہ مشاعرہ کے انعقاد اور آمدنی و خرچ کی مکمل ذمہ داری فائن آرٹس اکیڈیمی کو دی گئی۔ کانفرنس بے حد کامیاب ہوئی۔ مشاعرے سے فائن آرٹس اکیڈیمی کو کافی آمدنی ہوئی جب کہ حلقۂ ارباب ذوق کوئی مالی فائدہ حاصل نہ کرسکا۔

مزاح نگاروں کی کانفرنس کے بعد حلقۂ ارباب ذوق نے زندہ دلان حیدرآباد سے دوری اختیار کرتے ہوئے اپنے طور پر دو روزہ 'جشن مزاح' کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ مجتبیٰ حسین استقبالیہ کمیٹی کے معتمد عمومی مقرر ہوئے۔ طے ہوا کہ ۱۲ اور ۱۳ اگست ۱۹۶۷ء کو اس جشن کا گاندھی بھون میں انعقاد ہوگا۔ ان حالات میں فائن آرٹس اکیڈیمی نے اپنے طور پر ۲۰ مئی ۱۹۶۷ء کو زندہ دلان حیدرآباد کا دوسرا کل ہند مزاحیہ مشاعرہ منعقد کرلیا۔ اس موقع پر ایک خوب صورت سوویز بھی شایع ہوا۔

طنز و مزاح نگاروں کی کانفرنس کے انعقاد سے میل ملاپ کا جو ماحول پیدا ہوا تھا۔ اس پر 'جشن مزاح' نے کاری ضرب لگائی۔ کشیدگی اور دوریاں بڑھتی گئیں لیکن حالات کو سازگار بنانے کے لیے میں نے اکیڈیمی کے ادبی شعبہ کی ایک اڈھاک کمیٹی تشکیل دینے کی رائے دی جس کی معتمدی کے لیے مجتبیٰ حسین کو راضی کرلیا گیا۔ جناب بھارت چند کھنہ کمیٹی کے صدر اور جناب نریندر لوتھر نائب صدر تھے۔ ۱۹۶۸ء میں بڑے پیمانے پر تقاریب کا اہتمام کیا گیا۔ زندہ دلان حیدرآباد کی جانب سے طنز و مزاح کے دو اعلیٰ معیاری شعری مجموعے نشتر و مرہم (مجموعہ کلام رضا نقوی واہی) اور گھو کرو کے کانٹے (مجموعہ کلام علی صائب میاں) خوب صورت کتابت و طباعت سے آراستہ شایع کیے گئے۔ مطبوعات زندہ دلان حیدرآباد کی اشاعت کا شاندار پیمانے پر آغاز ہوا۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے کتابوں کی رسم اجرا کے جلسے کی صدارت کی۔ میری نگرانی میں اس پروجکٹ کا آغاز ہوا۔ طنزیہ و مزاحیہ کتابوں کی اشاعت اور نکاسی کا ایک نیا ماحول تیار ہوا۔ لیکن تلنگانہ تحریک کی شدت کے باعث پولیس نے ۱۹۶۹، ۱۹۷۰، ۱۹۷۱ میں جلسوں اور کانفرنس کے انعقاد کی اجازت نہیں دی۔ ۱۹۷۲ء میں مجتبیٰ حسین دلی روانہ ہوگئے۔ حلقہ ارباب ذوق کے معتمد عمومی حفیظ قیصر بھی بیرون ملک میں جا بسے۔

یکم نومبر ۱۹۶۸ء میں میری ادارت میں دیڑھ ماہی شگوفہ کا پہلا شمارہ شایع ہوا۔ اس کے لیے فائن آرٹس اکیڈیمی کے سینیئر ارکان کی دستخطوں کے ساتھ ایک معاہدہ طئے پایا تھا جس کے بموجب ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر مصطفیٰ کمال کی ملکیت میں شایع ہونے والے رسالہ شگوفہ زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان ہوگا۔ ۱۹۷۳ء کے منظورہ قواعد وضوابط میں اس معاہدہ کو ایک دفعہ کی صورت میں شریک کرلیا گیا۔

'جشن مزاح' گو کہ بڑے پیمانے پر منعقد ہوا لیکن اس جشن نے اردو طنز و مزاح کے فروغ کے لیے مل جل کر کام کرنے والوں کی پر خلوص متحدہ کوششوں کو سخت دھکا پہنچایا۔ تاہم زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ تقریبات بڑے اہتمام اور ڈسپلن کے ساتھ منعقد ہونے لگیں۔ حمایت بھائی اور فائن آرٹس اکیڈیمی کے دیگر سینیئر ارکان کو میں نے اس امر پر راضی کرلیا کہ ادبی شعبے زندہ دلان حیدراباد کو آزادانہ حیثیت دے دی جائے۔ اور فائن آرٹس کے موجودہ ارکان کے ساتھ طنز و مزاح نگاروں کو اس تنظیم میں شریک کیا جائے۔ اس ضمن میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے کنوینر موسیٰ کلیم برق آشیانوی تھے۔ فائن آرٹس اکیڈیمی کے نائب صدر اور سابق مجسٹریٹ وایڈوکیٹ دنیش چندر شاہ کی مدد سے قواعد وضوابط تیار کیے گئے اور ۱۰ جنوری ۱۹۶۲ء کو فائن آرٹس اکیڈیمی کی ایک قرارداد کے تحت تشکیل پائے ادبی شعبہ 'زندہ دلان حیدرآباد' کو پبلک سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ کے تحت رگھوبنسی نرل، مصطفیٰ کمال، سعادت علی خاں، ممتاز احمد اور حمایت اللہ کی تجویز اور وٹھل راؤ اور اسمعیل کی گواہی پر بہ طور ایک آزاد سوسائٹی ۱۹۷۳ء میں (No.148/1973) رجسٹر کرلیا گیا۔ جس کے ساتھ ہی ادارہ زندہ دلان حیدرآباد کا نیا سفر شروع ہوا۔

● شگوفہ کے ۵۱ ویں سال کے موقع پر عرصہ دراز سے مسلسل طنز و مزاح کی نگاری میں مصروف گلبرگہ کے ممتاز ادیب منظور وقار کے لیے ایک خصوصی گوشہ زیر نظر شمارے میں شریک ہے۔ منظور وقار کے تخلیقی شجر کی جڑیں معاشرے کی زمین میں پیوست ہیں۔ عوام کے روزمرہ معاملات اور مسائل ان کے بنیادی موضوع ہیں۔ ان کی تخلیقات سہ ابعادی آمیزہ ہیں۔ طنز و مزاح کے ساتھ احتجاج کی لہر تمام تحریروں میں موجزن نظر آتی ہے۔ احتجاج مزاح کی کیفیت کو کم کرتا ہے لیکن عام فرد کی لفظیات سے کھیلتے ہوئے منظور وقار عوامی زبان کے ذریعہ مزاح کا توازن برقرار رکھتے ہیں۔ منظور وقار کا مشاہدہ تیز ہے وہ محض تماشائی نہیں ہیں، نقد و تبصرہ ان کے مزاج کے لازمی عناصر ہیں۔ دیہی ماحول نے ان کو کسی قدر معصوم اور صاف گو و بے باک بھی بنادیا ہے۔ ان کا اپنا ایک فطری اسلوب ہے۔ جس پر تکلف کا سایہ ڈالنے کی وہ کبھی کوشش نہیں کرتے۔

یہ جملے میں نے دومنٹ میں لکھے ہیں اور منظور وقار کے مزاج کے مطابق ان پر نظر ثانی میں پسند نہیں کرتا!--

Athar Abdul Latif

Ph : 66668798
66667885
23387557
Mobile : 9848035160

Jawharatul Osman

JEWELLERS

G-1, Ground Floor,
Lenaine Estate,
Abids, Hyderabad-500 001.
Email : azharzaveri@yahoo.com

http://m.facebook.com/jawaharatulosmanjewellers
jawaharatul_osman_jewellers
athar 582
Ph : 9966002028
U.S.A : 773-225-5172

چائے کی دنیا میں
کامیاب چائے

ھائی ویا چائے

ملنے کا پتہ
نیشنل ٹی ڈپو
نامپلی بازار حیدرآباد
فون 23214076 - 23210072

Registered with Registrar of
News papers for India
Under RNI No. 15822/68
Vol. 52, Issue : 6, June 2019

51st Year of Publication
SHUGOOFA MONTHLY
10-4-771/82/A/1, Masab Tank, Hyderabad - 500 028.
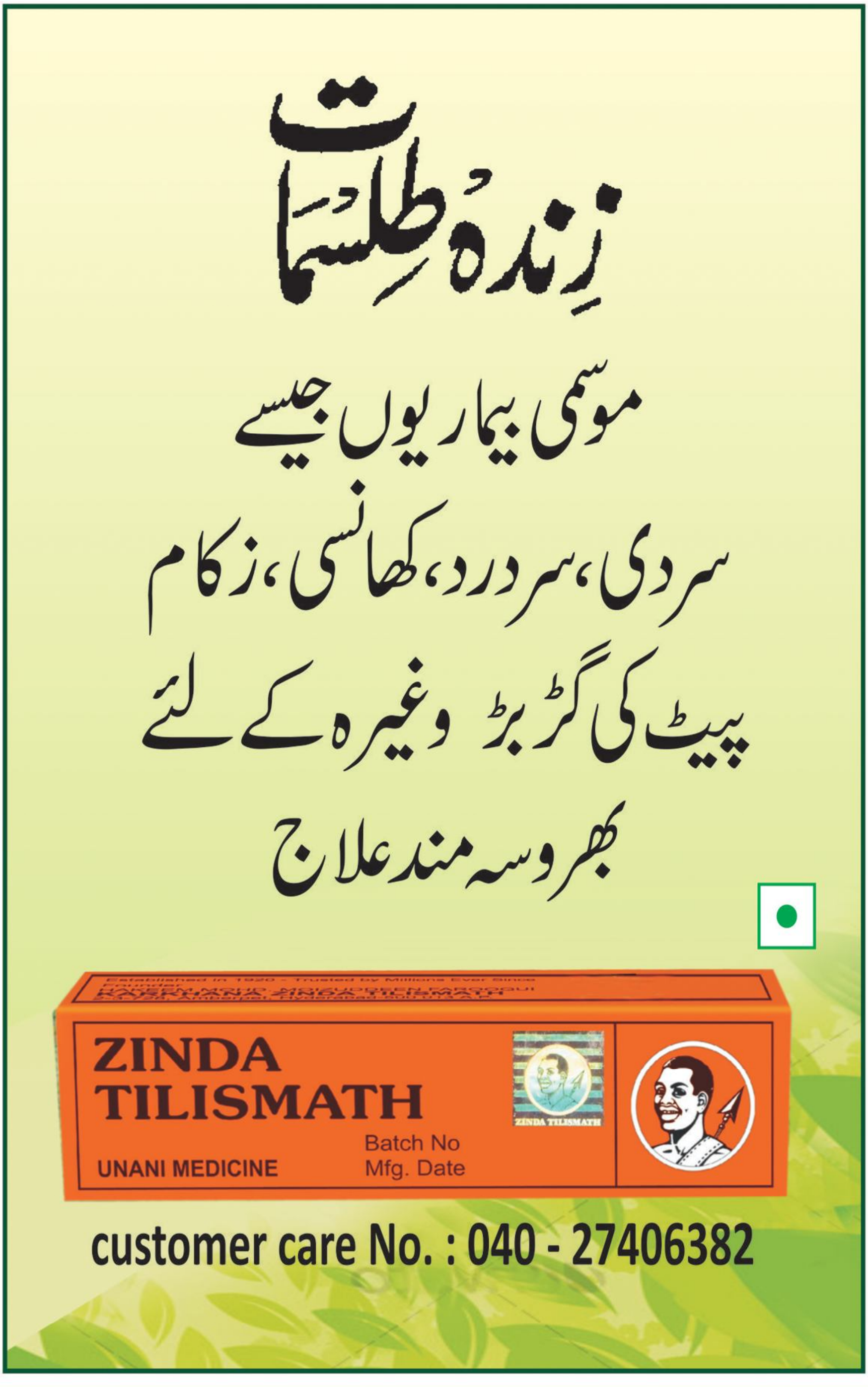
Registered Reg. No.
H-HD-GPO / 014/ 2018-2020
Published on 6th and Posted on
9th & 10th of Every Month
Pages : 66 Price : ₹ 25/-